دعوت وتربیت

اسلام کا نقطۂ نظر

مولانا سید جلال الدین عمری

فہرست عناوین

پیش لفظ	۵
امت مسلمہ ہند کے لیے صحیح لائحۂ عمل	۷
دعوتِ اسلام، جس پر امت مامور ہے	۱۳
کیا اسلام سے بہتر کوئی دعوت ہوسکتی ہے؟	۲۱
قرآن کا پیغام انسانیت کے نام	۳۱
قرآن مجید کی عظمت اور اس کے مطالعہ کے بعض پہلو	۴۵
تقویٰ کی زندگی	۵۵
دعوتِ دین اور اس کے تقاضے	۶۳
خطبۂ عید الفطر (جائزے اور احتساب کی ضرورت)	۷۵
ترجیحاتِ دین	۸۱
اختلاف میں عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑیے	۹۵
اصلاحِ اُمت (قرآن و حدیث راہ نمائی کرتے ہیں)	۱۰۳
اصلاحِ اُمت میں علماء کا کردار (موجودہ حالات کے پس منظر میں)	۱۱۳
اسلامی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے	۱۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کا نام ہے 'یہ ملک کدھر جا رہا ہے' اس کے تین ایڈیشن اردو میں اور تین ہندی میں نکل چکے ہیں۔ دوسرے مجموعے کا عنوان ہے 'ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں' اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں کے بیشتر مضامین کا تعلق سیاسی امور و مسائل سے ہے۔ اس وقت تیسرا مجموعہ 'دعوت و تربیت ـــــ اسلام کا نقطۂ نظر' پیشِ خدمت ہے۔ اس کے مضامین دعوتی اور اصلاحی نوعیت کے ہیں۔ ان مین اسلام کو اللہ کے آخری نازل کردہ دین کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ امت کو اس کی ذمے داریاں یاد دلائی گئی ہیں اور اصلاحِ حال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں قرآن و حدیث سے استناد کے ساتھ عقلی اپیل بھی ہے۔

یہ مضامین ایک طویل عرصہ میں لکھے گئے ہیں۔ ہر مضمون کے آخر میں ان کی تاریخِ اشاعت دے دی گئی ہے، ان مضامین کو مجموعہ کی شکل میں پیش کرنے سے پہلے میں نے ان پر نظر ثانی کی ہے اور بعض مضامین میں کافی حذف و اضافہ کیا ہے۔ ان میں دو چار خطابات بھی شامل ہیں، لیکن ان کو تحریری شکل دینے کے لیے ازسرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، اس لیے بعض باتیں ان میں

مشترک ہیں۔ میں نے تکرار سے بچنے کے لیے ممکنہ حد تک انھیں حذف کر دیا ہے، لیکن جہاں ضرورت محسوس ہوئی، اسلوب بدل کر انھیں باقی رکھا ہے، تاکہ مضمون کا تسلسل قائم رہے۔

بعض احباب اپنے مطالعے کے لیے اور دینی اجتماعات میں پڑھنے کے لیے چھوٹے چھوٹے مضامین کا تقاضا کرتے ہیں۔ امید ہے اس مجموعہ سے یہ ضرورت کسی حد تک پوری ہوگی۔ ایک نشست میں ایک مضمون آسانی سے پڑھا بھی جا سکتا ہے اور سنایا بھی جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور حسنِ عمل کی توفیق سے نوازے۔

جلال الدین عمری
۲۴/مئی ۲۰۰۸ء

یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس میں احتیاط کے ساتھ پروف ریڈنگ کی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کمپوزنگ میں غلطیاں نہ رہ جائیں۔ کہیں کہیں عبارت میں تھوڑی بہت اصلاح و ترمیم بھی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ ایڈیشن پہلے سے بہتر شکل میں پیش ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

جلال الدین عمری
۲۸/فروری ۲۰۱۲ء

اُمتِ مسلمہ ہند کے لیے صحیح لائحۂ عمل

اس وقت پوری اُمتِ مسلمہ تاریخ کے بڑے ہی نازک دور سے گزر رہی ہے۔ امت مسلمہ ہند اسی امت کا ایک حصہ ہے۔ وہ بھی انتہائی مشکل حالات اور گوناگوں مسائل سے دوچار ہے۔ اس کے حالات اتنے سخت اور اس کے مسائل اس قدر پیچیدہ ہیں کہ سوچنے سمجھنے والے بسا اوقات حیران اور ششدر رہ جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں جو اس امت کے عقیدہ وفکر، اس کے مزاج اور اس کی دینی روایات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔

ہندستان جیسے ملک میں اس امت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہاں اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی کیسے گزارے؟ اپنے وجود اور تشخص کو کس طرح برقرار رکھے؟ اپنے بنیادی حقوق کی، جو از روئے دستور بھی تسلیم شدہ ہیں، کیوں کر حفاظت کرے؟ اس کی معاشرت اور معیشت غیر اسلامی اثرات سے کیسے محفوظ ہو؟ یہاں کی اکثریت کے ساتھ، جو غیر مسلم ہے، اس کا کیا رویہ ہو؟ اس کے ساتھ تعاون کے کیا حدود ہوں؟ اس کی راہ میں جو تعصّبات اور نفرتیں حائل ہیں، انھیں کس طرح دور کرے؟ یہاں کی فضا کو اپنے حق میں کس طرح خوش گوار بنائے؟ ملک کے سیکولر نظام سے اس کے ربط وتعلق کی کیا نوعیت ہو؟ اور موجودہ حالات میں وہ کون سی سیاسی حکمتِ عملی اختیار کرے؟

ان مسائل کی سنگینی اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس ملک میں تقریباً پندرہ کروڑ کی تعداد میں (سرکاری اعداد وشمار کے اعتبار سے) ہونے کے باوجود یہ امت ایک اقلیت ہے۔ دیگر برادرانِ وطن کو، جو اکثریت میں ہیں، ہر میدان میں اس پر سبقت حاصل ہے۔ وہ تعلیم میں، جو ترقی کا لازمی ذریعہ ہے، ان سے پیچھے ہے۔ اس کے وسائلِ معیشت محدود ہیں اور وہ معاشی لحاظ سے کم زور ہے،ابلاغ وترسیل کے ذرائع پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہے، اس لیے وہ اپنی بات موثر انداز میں پیش نہیں کرسکتی۔ سیاست میں وہ کوئی قائدانہ کردار نہیں ادا کر پا رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان پیچیدہ حالات سے اس امت کے عہدہ برآ ہونے کی کوئی سبیل ہے؟ کیا وہ اس زوال سے نکل سکتی ہے، جو اس پر ہر طرف چھایا ہوا ہے؟ کیا اس پر عروج وترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں؟ کیا وہ دینی و اخلاقی لحاظ سے اوپر اٹھ سکتی ہے؟ کیا اس کے لیے اس ملک میں قائدانہ کردار ادا کرنا ممکن ہے؟ اس کا جواب ایک جملے میں یہ ہے کہ ہاں یہ سب کچھ ممکن ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس خدائے ذوالجلال کے احکام وقوانین پر کاربند ہوجائے، جو ہر پستی کو بلندی میں، ہر زوال کو عروج وترقی میں اور ہر کم زوری کو قوت و طاقت میں تبدیل کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور جس کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ○ (الحدید:۱۷)

خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد (بھی) زندہ کردیتا ہے۔ ہم نے اپنی آیات کھول کر بیان کردی ہیں۔ شاید تم عقل سے کام لو۔

جو خدائے بزرگ و برتر اپنے قوانین کے تحت مردہ زمین کو زندہ اور رات کو دن میں اور دن کو رات میں تبدیل کردیتا ہے، اسی کے متعین کردہ ضابطے قوموں کو عروج و زوال سے ہم کنار کرتے ہیں۔ عروج کے ضابطوں کو اختیار کرکے قومیں اپنی کم زوریوں

پر قابو پالیتی ہیں۔ ان کے مسائل اس طرح حل ہونے لگتے ہیں، جیسے وہ پہلے سے اپنے حل کے منتظر ہوں۔ ان کی راہ کی وہ ساری رکاوٹیں ایک ایک کر کے دور ہونے لگتی ہیں جو ناقابل عبور سمجھی جاتی ہیں اور وہ تیزی سے ترقی کے زینے طے کرنے لگتی ہیں۔ اب آیئے دیکھیں کہ وہ اصول کیا ہیں، جو اس امت کو حیاتِ نو عطا کر سکتے ہیں۔

قوموں کے عروج و ترقی میں ان کے نظریۂ حیات اور عقیدہ کا بڑا گہرا دخل ہوتا ہے۔ جس قوم کو اپنے عقیدے پر کامل یقین ہو اور اس کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر کا وہ فیصلہ کرلے اور اس کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوجائے، اس کی پیش قدمی کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ عقیدہ جتنا قوی اور مستحکم ہوگا، اس کی رفتارِ ترقی اتنی ہی تیز ہوگی۔ اگر کسی قوم کا اپنے عقیدے پر ایمان و یقین ختم ہوجائے تو زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ یہ اصول عقیدۂ حق کے لیے بھی ہے اور عقیدۂ باطل کے لیے بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو قوم عقیدۂ حق کو لے کر اُٹھے، اس کی پیش قدمی نوع انسانی کی فلاح و کامرانی کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور جس قوم کے ہاتھ میں باطل کا پرچم ہو، وہ دنیا کے لیے تباہ کن بن جاتی ہے۔

۱- اسلام نے اس امت کو کفر و شرک سے پاک توحید خالص کا عقیدہ دیا ہے۔ یہی اس کی قوت و توانائی کا سرچشمہ ہے۔ اسی سے اس کے اندر عزم و حوصلہ، جرأت و ہمت، اللہ پر توکل و اعتماد، استقامت اور پامردی، مہم جوئی اور خطرات سے کھیلنے کا حوصلہ، فہم و فراست اور دانائی کے ساتھ حالات سے مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ عقیدہ زندہ و متحرک ہو تو امت حالات کی سنگینی سے ہراساں اور خوف زدہ ہوگی اور نہ کم زوری اور بے بسی کا مظاہرہ کرے گی، بلکہ حالات کا رُخ موڑ کر انھیں اپنے حق میں سازگار کرلے گی۔ وہ اپنا سمتِ سفر خود متعین کرے گی۔ کسی کی طرف رہنمائی کے لیے نہیں دیکھے گی۔ صرف خدا کی طاقت پر اس کا بھروسہ ہوگا اور کوئی دوسری طاقت اسے مرعوب

اور خوف زدہ نہ کر سکے گی۔ وہ خدائے واحد کے سوا کسی کو نفع و نقصان اور موت و حیات کا مالک نہیں تصور کرے گی۔ دنیا اور متاعِ دنیا اس کی نگاہ میں حقیر ہوں گے اور آخرت کی کامیابی کو اصل کامیابی سمجھ کر اس کی طرف اس طرح دوڑے گی، جیسے پیاسا پانی کی طرف دوڑتا ہے۔ جب کسی گروہ کو ایمان کی یہ دولت مل جائے تو وہ خدا کی نصرت کی حق دار ہوتی ہے، کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومنے لگتی ہے اور وہ رزمِ حق و باطل میں: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○ (آل عمران:۱۳۹) (تم ہی سربلند ہوگے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔) کا رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

۲- اس وقت امت کا خدا اور اس کے رسول سے تعلق بڑی حد تک جذباتی ہے۔ وہ ان سے محبت کا اظہار تو کرتی ہے اور وقت ضرورت ان کے نام پر جان بھی دے سکتی ہے، لیکن اس کے اندر اطاعت کا جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا اور رسول کے تابع بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عبادات کی اس کے نزدیک وہ اہمیت نہیں ہے جو ہونی چاہیے۔ ان سے اس کی غفلت برقرار ہے۔ اگر کہیں عبادات کی پابندی ہے بھی تو یہ عبادات روح سے خالی اور بے جان نظر آتی ہیں۔ اس کی معاشرت اور معیشت پر غیر اسلامی اثرات بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں اور اپنی سیاست میں وہ غیروں سے رہنمائی حاصل کر رہی ہے۔ حالاں کہ اس امت کے تمام مسائل کا حل خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں موجود ہے۔ اسے کسی اور سمت میں دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے ہدایت کی گئی ہے کہ ہر شکل میں وہ خدا کی کتاب کی طرف رجوع کرے، اس کی ساری حیرانی اور سرگشتگی ختم ہوجائے گی۔ ظلمتیں کافور ہوجائیں گی اور چاروں طرف اسے نورِ ہدایت نظر آئے گا۔ اس کے ہادیِ برحق رسول اللہ ﷺ نے تاکید کے ساتھ اس سے کہا تھا:

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنۃ رسولہ

میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انھیں پکڑے رہوگے راہِ راست سے نہیں بھٹکوگے۔ وہ دو چیزیں ہیں: اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔ (مؤطا امام مالک)

ان ہی دو سرچشموں سے ہدایت حاصل کرکے وہ پہلے بھی کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھی اور آئندہ بھی ہوگی۔

۳- اس وقت یہ امت سخت اختلاف و انتشار کا شکار ہے۔ مصنوعی اور غیر حقیقی اختلافات نے اسے منتشر اور پراگندہ کر رکھا ہے۔ کہیں اس کے اندر ذات برادری کا جھگڑا ہے، حالاں کہ قبائلی اور خاندانی فرق کو حتّٰی کہ عرب و عجم کے اختلاف کو ختم کرکے یہ امت وجود میں آئی تھی۔ کہیں مسلکی و فقہی اختلافات ہیں۔ جب کہ یہ اختلافات خیر القرون سے چلے آرہے ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے درمیان ان کا ثبوت ملتا ہے۔ کہیں جماعتی تعصّبات ہیں جو ایک جماعت کو دوسری جماعت سے قریب ہونے نہیں دیتے اور جماعتیں باہم مشترک قدریں تلاش کرنے کی جگہ اختلاف کی بنیادیں ڈھونڈھنے میں لگی رہتی ہیں۔ کہیں ادارے اور انجمنیں نزاع اور اختلاف کا باعث ہیں۔ کہیں سیاسی گروہ بندیاں ہیں اور ایک گروہ کا مفاد اسے دوسرے گروہ سے دور کر رہا ہے۔ ہر طبقہ دوسرے سے اپنی قیادت منوانے کی فکر میں ہے، جب کہ اس امت کو اللہ کی کتاب کی بنیاد پر متحد ہونے اور باہم جڑ جانے کا حکم دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا:
وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا (آل عمران:۱۰۳) ”اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور باہم تفرقے میں مت پڑو۔“

جب تک پوری امت اپنے اختلافات کو بھول کر ایک مضبوط گروہ نہ بن جائے، کامیابی کی راہیں اس پر کھل نہیں سکتیں۔ اسے باہم مربوط اور سیسہ پلائی ہوئی

دیوار ہونا چاہیے، تاکہ کوئی اس میں شگاف نہ کرسکے۔ جب ذراسا بھی شگاف ہوگا تو مخالف طاقتیں اپنی سازشوں سے اس شگاف کو وسیع تر کردیں گی اوز اسے فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کرکے چھوڑیں گی۔

جماعت اسلامی ہند امت کے مسائل پر اسی ڈھنگ سے سوچتی ہے اور انہی خطوط پر انھیں حل کرنا چاہتی ہے۔ وہ امت کے اندر ایمان کی روح پیدا کرنے، خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی بنیاد پر اسے جوڑنے اور اس کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف ہے۔ اس کے ثمرات مایوس کن نہیں بلکہ حوصلہ افزا ہیں۔ اس کی کوششیں اسی سمت میں جاری رہیں گی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہم کنار کردے۔ (ماہ نامہ 'زندگی نو' اپریل ۱۹۹۶ء)

☆☆

دعوتِ اسلام

جس پر اُمت مامور ہے

دبئ (متحدہ عرب امارات) میں ہر سال بڑے پیمانے پر World Trade festival (عالمی تجارتی نمائش) ہوتا ہے۔ اس موقعے پر غالباً بعض دینی پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں۔ اب کی بار فیسٹول کمیٹی کی طرف سے اس عاجز کو اردو بولنے والے اصحاب سے خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ مرکزی موضوع تھا: "One family one world" اس مناسبت سے میرے لیے عنوان ''خاندان میں مسلمان عورت کا کردار'' تجویز ہوا۔ ۲۹/جنوری ۲۰۰۳ء کو میں دبئ پہنچا۔ ۳۰/جنوری کو بعد مغرب دبئ چیمبر آف کامرس میں لیکچر کا انتظام تھا۔ شیخ عارف عبدالکریم جلفار، جو اس کے داعی تھے، ان کے افتتاحی کلمات سے اجلاس کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اس عاجز کی تقریر تھی۔ ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ ہال کے باہر بھی خاصی بڑی تعداد تقریر سن رہی تھی۔ دو ڈھائی ہزار افراد کی شرکت رہی، جو وہاں کے لحاظ سے غیر معمولی بات تھی۔ خواتین بھی کافی تعداد میں موجود تھیں۔ شرکاء میں کیرلا کے احباب بڑی تعداد میں تھے، اس لیے تقریر کے

بعد اس کا ملیالم ترجمہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ الحمد للہ پروگرام کامیاب رہا۔ احباب اور رفقاء کی خواہش پر شارجہ، ابوظبی اور العین جانا ہوا۔ ان سب مقامات پر مختلف دینی موضوعات پر اظہارِ خیال کا موقع ملا۔ دبئی سے قطر کے لیے روانگی ہوئی۔ دو تین دن قیام رہا۔ قطر میں کئی پروگرام ہوئے۔ ایک پروگرام عرب علماء اور ہندوستانی احباب سے ملاقات کا تھا۔ اس کے لیے ذیل کا مقالہ لکھا گیا۔ عرب علماء کی رعایت سے اس کا عربی ترجمہ راقم نے پڑھا۔ اب اصل مضمون یہاں کسی قدر نظرِ ثانی کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرے۔

(جلال الدین)

اس امت کی ایک تاریخ ہے، عظیم الشان تاریخ، ایسی تاریخ کہ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اس تاریخ پر ہم فخر کرتے ہیں اور بجا طور پر کرتے ہیں۔ اس تاریخ کے ساتھ ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت انقلاب کا تصور وابستہ ہے، ایسا انقلاب کہ اس سے زیادہ صاف ستھرا، پاکیزہ اور نوعِ انسانی کے لیے باعثِ خیر و فلاح انقلاب چشمِ فلک نے نہیں دیکھا۔ یہ خالص اسلامی انقلاب تھا جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ذریعے برپا ہوا۔ عرب کی سرزمین اس کی اوّلین تجربہ گاہ تھی۔ اس انقلاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے سب سے پہلے فرد کو خطاب کیا۔ امیر اور غریب، آزاد اور غلام، مرد اور عورت، پیر و جواں، سردارانِ قوم اور ان کے ماتحت عوام، سب اس کے مخاطب تھے۔ ان میں سے جس کسی نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور جو اس کے دائرے میں آیا اس نے اس کے عقیدے اور فکر کو پوری طرح بدل ڈالا، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق و اختیارات سے بے خبر تھا، اس نے اسے اس سے واقف کرایا،

وہ اللہ تعالیٰ سے دور تھا، اس نے اسے اس سے قریب کیا اور اس کا تعلق اس سے استوار کیا، وہ عبادت اور تقویٰ و طہارت سے نا آشنا تھا، اس نے اسے اس سے لذتِ آشنا کیا۔ بہت سی جان دار اور بے جان مخلوقات کی پرستش نے اس کی جبین داغ دار تھی، اس نے اسے ہر غلامی سے آزاد کر کے اللہ تعالیٰ کا غلام اور اس کا بندۂ مومن و مخلص بنایا۔ وہ اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت سے بے خبر تھا اور مسلسل انھیں پامال کر رہا تھا، اسلام نے اسے حسنِ اخلاق سے آراستہ کیا۔ اس کے اندر راست بازی، دیانت و امانت، ہمدردی و غم گساری اور اپنوں اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا جذبہ پیدا کیا۔ اس کی تہذیب و معاشرت گندگیوں سے آلودہ تھی، اس نے اسے ایک شستہ تہذیب اور پاکیزہ معاشرت سے روشناس کرایا، وہ عدل و انصاف اور مساوات پر مبنی قانون کا تصور نہیں رکھتا تھا، اس نے اسے قانونِ عدل و انصاف کی راہ دکھائی۔ اقتدار و حکومت کو حقوقِ انسانی کا محافظ اور پاس دار بنایا اور اسے بشری خامیوں اور بے اعتدالیوں سے پاک حکم رانی کے اصول اور نظامِ سیاست عطا کیا اور اسے قومی و ملکی تعصّبات کے گرداب سے نکال کر انسانیت کے وسیع تصور سے ہم کنار کیا۔ اس طرح اسے ایک ایسا انسان بنایا جو اپنے فکر و عمل اور سیرت و کردار کے لحاظ سے بالکل ممتاز اور منفرد تھا۔

ان افکار اور سیرت کے حامل افراد سے دنیا کے نقشہ پر ایک نئی اُمت وجود میں آئی، جس کے سامنے ایک بہت ہی اعلیٰ و ارفع مقصد تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے تمام ذاتی، خاندانی، قبائلی اور قومی اختلافات ختم کر دیے اور ایک مضبوط وحدت اور بنیانِ مرصوص بن گئی۔ اس کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ جو دین اسے ملا ہے، اسے سارے عالم میں عام کرے، اسے انسانوں کے تمام طبقات اور گروہوں کے سامنے دلائل کی پوری قوت کے ساتھ پیش کرے اور اس کے برحق ہونے کی اپنے قول و عمل سے شہادت دے، چناں چہ یہ امت اٹھی اور اس نے دنیا کو بتایا کہ اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے عقیدے ہی میں فرد کی نجات اور معاشرے کی فلاح پوشیدہ ہے، اس کے علاوہ اس کا

کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ دنیا میں جب کبھی ظلم و زیادتی، فساد اور بگاڑ، حقوق کی پامالی، جبر و اکراہ، قوموں کا استحصال، قتلِ اولاد، زنا اور بدکاری، عریانی اور بداخلاقی، بزرگوں کا عدمِ احترام اور خوردوں سے عدمِ شفقت، دنیا کی محبت، دولت کی حرص، اس کے لیے غلط قسم کی مسابقت اور فساد فی الارض جیسی خرابیاں دیکھی گئیں وہ سب خدا اور آخرت کے انکار اور اس کی ہدایت سے بے نیازی کا نتیجہ تھیں۔ اگر خدا اور آخرت کے عقیدے کو قبول کرلیا جائے اور اس کی ہدایت کی پابندی کی جائے تو انسان یک لخت بدل جائے گا، اس کا کردار بدل جائے گا اور پورا سماج امن و امان اور عدل و انصاف سے بہرہ ور ہوگا۔ یہی فکر اور یہی کردار انسان کو آخرت کی کامیابی سے بھی ہم کنار کرے گا۔

جب یہ اُمت اس پیغام کو لے کر اُٹھی تو دنیا کے باطل نظریات سمٹنے لگے اور دنیا نے بہت جلد اس پیغام کا اس طرح استقبال کیا، جیسے وہ صدیوں سے اس کی منتظر تھی۔ اس کے نتیجے میں یہ اُمت دنیا کی رہنما بن گئی اور امامت و قیادت اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے اپنے تمام ذرائع و وسائل اس پیغام کو عام کرنے، اس کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اسے نافذ کرنے میں لگا دیے۔ اس نے انسان کے اندر آخرت کی طلب بھی پیدا کی اور دنیا کے مسائل بھی حل کیے۔ اس کی مادّی و روحانی تمام الجھنیں رفع کیں اور اسے قلبی راحت اور سکون فراہم کیا۔ مادّی لحاظ سے غیر معمولی ترقی کی، علم و فن کے نئے گوشے دریافت کیے، سائنس اور ادب میں نمایاں کارنامے انجام دیے، عدل و انصاف پر مبنی قانون اور بہترین نظامِ حکومت و سیاست عطا کیا۔

اس کے بعد اس امت کا دورِ زوال شروع ہوا۔ یہ زوال فرد کا بھی تھا اور معاشرے کا بھی، بلکہ فرد کا زوال ہی معاشرے کے زوال کا سبب بنا۔ اس کا عقیدہ اور فکر، جس نے اسے قوت اور توانائی بخشی تھی، مضمحل ہونے لگا۔ اس کی دینی و اخلاقی حیثیت، جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز نظر آتا تھا، مسلسل مجروح ہوتی چلی گئی۔ اس کا دینی رُخ، جس نے اسے دنیاداروں اور مادّہ پرستوں پر فوقیت دی تھی، باقی نہیں

رہا۔ اس کے عقائد و افکار جو عقل و فطرت کے عین مطابق تھے، یونانی اور عجمی فلسفہ سے متاثر ہونے لگے۔ اس کے اندر آخرت کی طلب اور وہاں کی کامیابی کی تمنا کی جگہ دنیا کی طلب ابھر آئی اور مادّی خوش حالی اس کا مقصدِ حیات بن گئی اور وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگی۔ امت کے درد مند افراد اور اس کے بہی خواہوں نے، علماء و مفکرین اور مصلحین نے اس کی اصلاح کی قابلِ قدر اور غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ مخالفِ اسلام افکار و خیالات کا جواب دیا گیا، اسلام کے عقائد اور اس کی تعلیمات کی معقولیت اور حکمت و معنویت واضح کی گئی اور حالات کے لحاظ سے مختلف علوم و فنون کی تدوین و ترتیب عمل میں آئی۔ اس کے ساتھ امت کی تربیت و تزکیہ اور اسے دینی اور اخلاقی لحاظ سے اوپر اٹھانے کی کوشش بھی جاری رہی۔ ان مختلف الجہات کوششوں کے مفید نتائج سامنے آئے۔ دین ہر طرح کے تغیر و تبدل سے محفوظ رہا، اس کی صحیح شکل میں ترجمانی ہوتی رہی اور امت کلی فساد و بگاڑ سے بڑی حد تک بچی رہی اور رسول اللہ ﷺ کی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہوتی رہی۔

لاَ یزال من اُمتی امة قائمة بامر اللّٰه، لاَ یضرھم من خذلھم و لاَ من خالفھم حتی یأتی امـر اللّٰه و ھم علیٰ ذٰلک (متفق علیہ)

میری امت کا ایک گروہ اللہ کے احکام اور شریعت کو لے کر کھڑا رہے گا، جو اُن کو چھوڑ دے گا یا ان کی مخالفت کرے گا وہ انھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ (قربِ قیامت) آجائے اور وہ اسی حال میں رہیں گے۔

اُمت کے اندر جو اصلاحی اور علمی و فکری مساعی ہوتی رہیں، ان کی قدر و قیمت کے اعتراف کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ماننا پڑے گا کہ امت کی توجہ بڑی حد تک اس کے داخلی مسائل کی طرف رہی۔ خارج میں اس کا جو ہدف ہونا چاہیے وہ نہیں رہا۔ یہ بات اس کی نگاہوں کے سامنے جس اہمیت کے ساتھ ہونی چاہیے تھی، اس اہمیت کے ساتھ نہیں رہی کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی ہدایت اور راہ نمائی کا کام اس سے لینا چاہتا ہے۔ اس

نے اس کے متعلق صاف الفاظ میں کہا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران:۱۱۰)	تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لیے نکالی گئی ہے۔ معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس امت کو یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ دنیا کے لیے باعثِ خیر ہے، اس کے پاس بہترین عقیدہ اور فکر ہے، اعلیٰ اخلاقیات ہیں، پاکیزہ معاشرت ہے، معاشیات کے متوازن اصول ہیں، عدل و انصاف ہے، انسانی حقوق کا وسیع تصور اور اس کا احترام ہے، بہترین قانون اور فلسفۂ سیاست ہے۔ یہ امت رفتارِ زمانہ کے ساتھ بڑی حد تک اپنے اس مرتبہ و مقام کو فراموش کر بیٹھی کہ اسے 'شہادت علی الناس' اور 'دعوت الی اللہ' کا فرض انجام دینا ہے۔ اس کا وجود اس لیے ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اس بات کی گواہی دے کہ اسلام ہی دینِ حق ہے، اور اس کی حقانیت واضح کرے اور اس کے پاس دین کی جو امانت ہے، اسے دوسروں تک پہنچائے۔ یہی چیز اس امت کی حیات اور توانائی کا ذریعہ تھی، لیکن افسوس کہ اس فرض سے اس نے غفلت اور کوتاہی برتی اور اب بھی برت رہی ہے۔

جب کسی قوم کے سامنے خارج کا کوئی ہدف نہیں ہوتا تو وہ اپنے دائرے میں سمٹتی چلی جاتی ہے۔ اسے حرکت و عمل کے لیے کوئی بڑا محرک نہیں ملتا، وہ میدانِ کار نہیں ہوتا، جس میں اپنی فکری و عملی توانائیوں کا مظاہرہ کرے۔ اس کے اندر وہ اوصاف نہیں پیدا ہوتے جو اسے دنیا میں سربلندی عطا کرتے ہیں، اس کے اندر عزم و ہمت، حوصلہ اور صبر و استقامت جیسے اوصاف نہیں پرورش پاتے، اس کی خفیہ صلاحیتیں نہیں ابھرتیں، اس کے اندر وہ خوبیاں نہیں نشو و نما پاتیں جو سیادت و قیادت کے لیے ضروری ہیں، اس کے اندر باہر کی دنیا کو دیکھنے اور مخالف قوتوں کو چیلنج کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوتی۔

آج یہ محسوس ہو رہا ہے، جیسے امت بغیر کسی ہدف کے جی رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی پچھلی تاریخ دہرائے، وہ اس پیغام کو لے کر اُٹھے جس نے

اسے دنیا میں سربلندی عطا کی تھی، وہ اس ایمان و یقین سے سرشار ہوکر سامنے آئے کہ اس کے پاس حق ہے اور دنیا کو اس کی ضرورت ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ یہ امت دنیا کو یہ نہیں بتا پا رہی ہے کہ اس کے پاس اللہ کا دین ہے، اسی میں اس کی دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔ یہ ان کے مسائل کو حل کرسکتا ہے، یہ خدا کا نازل کردہ دین ہے، اس لیے بشری کم زوریوں اور خامیوں سے، اور گروہی، قومی اور نسلی تعصّبات سے پاک ہے۔ یہ کسی قوم کا دین نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی دین ہے، جو ہر خطے، ہر ملک اور ہر نسل کے لیے ہے۔ ہمارے خیال میں اب ہمارے کرنے کے دو کام ہیں: ایک یہ کہ اس امت کے افراد کو اور بحیثیت مجموعی پوری امت کو دینی اور اخلاقی حیثیت سے اوپر اٹھایا جائے اور اسے 'خیر امت' کے مقام پر پہنچایا جائے، اس کے اخلاق و کردار کے بارے میں اور اس کی صلاحیتوں کے بارے میں جو شدید بدگمانیاں ہیں ان کو دور کیا جائے، اس کا تعارف طویل عرصے سے ایک جاہل، عیاش، غلط کار، جابر و قاہر اور دہشت پسند گروہ کی حیثیت سے کرایا جا رہا ہے، اس لیے اس سے قریب ہونا بھی کوئی گوارا نہیں کرتا۔ اس کی اس تصویر کو بدلنے اور اس کی بہتر تصویر بنانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے خارج میں جو ہدف مقرر کیا ہے وہ اور اس کے تقاضے پوری قوت کے ساتھ واضح کیے جائیں اور اس ہدف کی طرف پیش قدمی کے لیے اسے فکری، عملی، دینی اور اخلاقی حیثیت سے تیار کیا جائے۔

یہ کام آپ جیسے اصحابِ علم و دانش ہی سے ممکن ہے۔ اگر اس امت کے سوچنے سمجھنے والے لوگ اٹھ کھڑے ہوں تو اس کا کردار بھی بدل سکتا ہے اور وہ دنیا میں اپنا فرض بھی ادا کرسکتی ہے۔ اس امت کی اصلاح خود اسی کے ہاتھوں میں ہے، کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ یہ امت اپنا مقام پہچان لے اور اس کے تقاضے پورے کرنے لگے تو خود اس کی حالت ہی تبدیل نہیں ہوگی بلکہ اللہ نے چاہا تو پوری دنیا کا نقشہ بدل جائے گا۔

(سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۲۰۰۳ء)

کیا اسلام سے بہتر کوئی دعوت ہو سکتی ہے؟[۱]

حمد و صلوٰۃ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم○

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم○

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ○ وَلاَ تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلاَ السَّیِّئَۃُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَـدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ○ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلاَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْاط وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلاَّ ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ○

(حٰمٓ السجدہ: ۳۳-۳۵)

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبی نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو، جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔

---

[۱] مسجد اشاعتِ اسلام دعوت نگر، نئی دہلی میں عید الفطر ۱۴۲۹ھ (۱۴/اکتوبر ۲۰۰۷ء) کے موقع پر جو خطبہ دیا گیا اسے یہاں مرتب کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کتابچہ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

بزرگو، بھائیو اور نوجوانو! محترم خواتین ، ماوٗ، بہنواور بیٹیو! آج عید کا دن ہے۔ ہم سب کو خوشی ہے اس بات کی کہ ماہِ رمضان آیا۔ ہم نے اس میں روزے رکھے، تراویح کی نماز ادا کی، قرآن شریف کا معمول سے زیادہ مطالعہ کیا، اس کی تلاوت کی اور صدقہ و خیرات بھی حسب توفیق کی۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو قبول فرمائے۔ لیکن یہ بات ہمیں نہیں فراموش کرنی چاہیے کہ یہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کا محض فضل ہے۔ یہ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم اتنی مشکل عبادات سے عہدہ برآ ہوں۔ اس کا کرم، اس کی نوازش اور اس کی عنایت ہے کہ ایک مشکل عبادت ہم نے انجام دی اور اپنی مصروفیات بھی جاری رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس کرم و احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یہ دوگانہ نماز عید الفطر رکھی گئی ہے۔

آپ جانتے ہیں جمعہ میں پہلے خطبہ ہوتا ہے بعد میں نماز ہوتی ہے، لیکن یہاں حکم دیا گیا کہ سب سے پہلے خدا کے سامنے سر جھکاوٗ کہ اس نے تمھیں اسلام کی دولت عطا کی اور اتنی عبادات کی توفیق دی۔ پہلے سر جھکاوٗ اور اس کا شکریہ ادا کرو۔ روزے کے جہاں احکام دیے گئے ہیں، وہاں یہ بھی کہا گیا ہے :

وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○ (البقرۃ:۱۸۵) اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے، اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔

اللہ تعالیٰ کی بزرگی و برتری کے اظہار کی ایک صورت تکبیر بھی ہے۔ بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ اسی کے لیے تکبیریں رکھی گئی ہیں۔ اسی لیے عید گاہ کے لیے نکلنے سے لے کر نماز شروع ہونے تک زاید تکبیر جاری رکھنے کا حکم ہے اور اسی مقصد سے نماز عید میں زائد تکبیریں رکھی گئی ہیں۔ تکبیر کے ذریعہ اللہ کی عظمت اور بڑائی کا اظہار ہوتا ہے۔ نماز کے ذریعے آدمی اس کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اُسے رمضان کی عبادات کی توفیق عنایت فرمائی۔ اگر کسی سے رمضان میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو

معافی مانگے کہ ہم سے کوتاہی ہوگئی ہے، آیندہ نہیں ہوگی۔ اور یہ ارادہ کرے کہ جو کچھ ہو چکا، ہو چکا، آیندہ نہیں ہوگا، اب غفلت نہیں ہوگی۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کردے گا۔

میرے دوستو اور ساتھیو! اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ اس نے ہمیں قرآنِ مجید جیسی کتابِ ہدایت سے نوازا اور محمد عربی ﷺ، جن پر ہزار بار ہماری جانیں نثار ہوں، جیسا قائد اور رہنما عطا فرمایا۔ ورنہ آپؐ کے آنے سے پہلے جس طرح دنیا جہالت اور جاہلیت میں مبتلا تھی، ہم بھی شاید اسی طرح جہالت اور جاہلیت کی زندگی گزارتے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ محمد ﷺ کے ذریعے اس نے ہمیں اس سے نجات دی اور آپؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ آپ کے آنے سے پہلے دنیا شرک اور کفر میں مبتلا تھی، اللہ کو بھولی ہوئی تھی، آخرت کا کوئی تصور نہیں رکھتی تھی، گروہوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ یہ گروہ اور فرقے آپس میں دست و گریباں تھے، خون خرابہ ہو رہا تھا۔ بداخلاقی تھی، عفت و عصمت تار تار ہو رہی تھی۔ بیسواؤں اور طوائفوں کے کوٹھے موجود تھے اور وہاں لوگ اپنے گندے جذبات کی تسکین کے لیے جاتے تھے اور اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لونڈیوں سے بیسوائی کا کام لیا جاتا تھا۔ ایک گندی تہذیب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا۔ اور حکم دیا کہ آپؐ اس کے خلاف علم بغاوت بلند کریں اور ان کو بتائیں کہ زندگی کا یہ طریقہ غلط ہے۔ زندگی اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی جانوروں کی طرح اپنے شب و روز گزارے۔ انسان، انسان ہے، اس کے لیے اللہ نے ایک طریقۂ حیات بتایا ہے۔ قرآن نے راہِ ہدایت دکھانی شروع کی۔ نبی ﷺ اس کی تشریح فرمانے لگے۔ لوگوں نے اللہ کی ہدایت اور رسول اللہ ﷺ کی راہ نمائی قبول کرنے سے انکار کردیا اور اس کی مخالفت شروع کردی کہ توحید کا جو عقیدہ پیش کیا جا رہا ہے، ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ شرک ہی صحیح ہے، کفر ہی صحیح ہے، وہی راستہ صحیح ہے جس پر ہم چل رہے ہیں۔ ہماری تہذیب ہی ہمیں پسند ہے، ہمارا تمدن ہی

اچھا ہے، ہمیں اپنا ہی کلچر چاہیے۔ اگر ہم اپنی برتری کے لیے لڑتے ہیں تو غلط نہیں کرتے اس کے لیے آئندہ بھی لڑتے رہیں گے۔ اس ضلالت و گم راہی سے نکالنے کی جو بے غرض کوشش آپ فرما رہے تھے، اس کے متعلق وہ کہتے تھے۔ 'اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ' کہ بظاہر اللہ اور رسول کا نام لیا جارہا ہے لیکن اس کے پیچھے تو کچھ اور ہی مقاصد ہیں۔ یہ غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہمارے اقتدار کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور ہماری تہذیب کو مٹانا چاہتے ہیں ۔ فرعون نے بھی یہی کہا تھا کہ حضرت موسیٰؑ تمھارے دین کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ چناں چہ آپ کے مخالفین آپ کے خلاف صف آرا ہوگئے اور اپنے غلط سماج کو آواز دی کہ آؤ اپنے عقیدے پر، اپنی تہذیب پر اور اپنے کلچر پر جم جاؤ، اس سے نہ ہٹو۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اس کے باوجود آپؐ کی دعوت پھیل رہی ہے اور صحیح ڈھنگ سے سوچنے سمجھنے والے اسے قبول کر رہے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ قرآن کی اس آواز کو بلند ہونے نہ دو، یہ آواز ہمارے لیے خطرہ ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۝ (حٰمٓ سجدہ:۲۶)

ان کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور قرآن اگر کہیں پیش کیا جارہا ہو (پڑھا جارہا ہو، اس کی دعوت دی جارہی ہو) تو شور اور ہنگامہ کرو تاکہ (اس کی آواز دب جائے اور) تمھاری آواز اونچی رہے۔

ظاہر ہے آدمی جب دلائل کے میدان میں شکست کھا جاتا ہے تو یہی سب حربے استعمال کرتا ہے۔ انھوں نے بھی یہی کیا اور کہا کہ قرآن کی آواز کو بلند نہ ہونے دیا جائے، اسے دبا اور کچل دیا جائے اور قرآن پیش کیا جائے تو کہا جائے کہ ہم اسے سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایسا شور اور ہنگامہ ہو کہ یہ آواز دب کر رہ جائے اگر کچھ لوگ قرآن کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں تو طوائفوں کو بلاؤ اور قصے کہانیاں سنانے والوں کو جمع کرو کہ وہ آئیں اور قرآن کا مقابلہ کریں۔ اس کے لیے

انھوں نے کلچر کے نام پر گندے پروگرام شروع کیے۔ قرآن نے حیرت سے کہا کہ اللہ کے ایسے بندے بھی اس دنیا کے اندر موجود ہیں جو لغو اور بے ہودہ چیزوں کو خریدتے ہیں اور قرآن کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ اللہ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو حکم دیا کہ آپ صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جایئے۔ ایک دن آپ ہی غالب ہوں گے۔ 'كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ' (المجادلہ:۲۱) ''اللہ کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول غالب رہیں گے''۔

میرے دوستو اور ساتھیو! آپ کی تابناک تاریخ ہے کہ بہت ہی مختصر مدت میں اور چند برسوں میں عرب کی دنیا بدل گئی، وہ ویسی نہیں رہی جیسی تھی، بلکہ ویسی ہوگئی جیسی قرآن نے چاہا، محمد عربی ﷺ نے چاہا اور آپ کے صحابہؓ نے چاہا۔ اب یہ دنیا ان کے ہاتھ میں تھی، ان کے دشمنوں کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ انھوں نے جو عقیدہ دیا وہ اس کا عقیدہ بن گیا، انھوں نے جو اخلاق دیے وہ اس کے اخلاق بن گئے اور انھوں نے جو تہذیب دی وہ اس کی تہذیب بن گئی۔

سرزمین عرب کے اس کامیاب تجربے کے بعد آپ کو آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوا کہ وہ دنیا کو راہ دکھائیں۔ یہاں فاسد عقائد کی جگہ صحیح و پاکیزہ عقیدہ ہونا چاہیے، غلط فکر کی جگہ صحیح فکر ہونی چاہیے، ناشایستہ تہذیب کی جگہ شایستہ تہذیب ہونی چاہیے اور رذیل اخلاقیات کی جگہ اعلیٰ اخلاق ہونے چاہییں۔ یہ دنیا اس لیے نہیں ہے کہ غلط کار و گم راہ لوگ حکم رانی کریں، بلکہ اس کی تعمیر نیک اور صالح ہاتھوں سے ہونی چاہیے۔

میرے دینی بھائیو! محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو امت برپا کی تھی، وہ دنیا کے بڑے حصے میں پھیل گئی، تہذیب کے مراکز کو اپنے قبضے میں کرلیا اور اپنی تہذیب نافذ کردی، اپنا فکر نافذ کردیا۔ ہم اس کے جانشین بنے۔ ہم نے اس کا حق نہیں ادا کیا،

لیکن ہماری ہزار غلطیوں کے باوجود ہمارا اقتدار صدیوں تک باقی رہا اور اللہ کا قانون بڑی حد تک نافذ بھی رہا۔

دوستو! اور ساتھیو! آج پھر دنیا اسی حال میں پہنچ گئی ہے، جس حال میں نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ علم کے دعووں کے باوجود، جہالت کا اور تہذیب کے دعووں کے باوجود جاہلیت کا دور دورہ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا بالکل دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک طرف طاقتور قومیں ہیں، دوسری طرف کمزور قومیں۔ طاقتور قومیں کمزور قوموں پر بزور اپنا فکر مسلط کرنا چاہتی ہیں، اپنی تہذیب مسلط کرنا چاہتی ہیں، اپنے اخلاق مسلط کرنا چاہتی ہیں، اپنی معیشت مسلط کرنا چاہتی ہیں، اپنا طور طریقہ مسلط کرنا چاہتی ہیں اور کمزور قوموں کے پاس جو کچھ وسائل ہیں ان پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی آزادی پر شب خون مار رہی ہیں اور اسے ختم کرنا چاہتی ہیں ۔ یہ ظلم و زیادتی کی آخری حد ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ظلم باقی رہے گا یا اسے باقی رہنا چاہیے؟ ہم سب یہی کہیں گے کہ اسے ہرگز باقی نہیں رہنا چاہیے اور اللہ نے چاہا تو یہ باقی نہیں رہے گا۔

آج جب کہا جاتا ہے کہ اسلام اس ظلم کو مٹانا چاہتا ہے، وہ عدل و انصاف عطا کرتا ہے وہ ہر ایک کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے، وہ موجودہ گندی تہذیب کے مقابلے میں پاکیزہ تہذیب چاہتا ہے اور مسائل کے بارے میں عادلانہ نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ تم بے خدا تہذیب چاہتے ہو اسلام باخدا تہذیب چاہتا ہے، تم خدا کی ہدایت سے بے نیاز چل رہے ہو، اسلام چاہتا ہے کہ انسان خدا کی ہدایت کا پابند رہے۔ جب اسلام کی یہ تعلیم پیش کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ فرسودہ تصورات ہیں، یہ چلنے والے نہیں ہیں۔ باقی رہے گا تو ہمارا قافلۂ حیات باقی رہے گا، ہماری تہذیب باقی رہے گی، ہمارا کلچر باقی رہے گا۔ دیکھو ہم نے خدا کا انکار کرکے ترقی کی ہے یا نہیں؟ وہ اسلام جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ کیا ہے؟ وہ تو دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے، حقوق کو پامال

کرتا ہے، فساد برپا کرتا اور قوموں کو لڑاتا ہے، مذہب نے ہمیشہ دنیا میں تباہی مچائی ہے اور آج پھر یہ تباہی مچانا چاہتا ہے، اسلام کا حوالہ نہ دو، وہ ہمیں دورِ ظلمت میں لے جانا چاہتا ہے۔ ہم اس کا نام تک سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اگر آپ کہیں کہ اسلام ایک نظریۂ حیات ہے، وہ تمھارے یا ہمارے ہی لیے نہیں، ساری دنیا کے لیے ہے، دیکھو اس پر غور کرو، تو جواب دیا جاتا ہے کہ اس پر ہم غور نہیں کریں گے۔ قرآن نے عرب کے جاہلوں سے کہا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ ''اس سے بہتر بات کس شخص کی ہوگی، جو اللہ کی طرف بلا رہا ہے۔'' تم قوموں کی طرف بلاتے ہو، قبیلوں کی طرف بلاتے ہو، افراد کی طرف بلاتے ہو، ملکوں کی طرف بلاتے ہو، کیا اس کے مقابلے میں یہ بات زیادہ بہتر نہیں، زیادہ اونچی اور برتر نہیں کہ دنیا کو اللہ کی طرف بلایا جائے۔ قرآن نے کہا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ ''بتاؤ اس سے بہتر بات کس کی ہوسکتی ہے، جو اللہِ واحد کی طرف بلا رہا ہے اور اس کے مطابق عمل کر رہا ہے۔'' یہ نہیں کہ صرف وعظ ہے، نصیحت ہے، بلکہ وہ اس کے مطابق عمل بھی کر رہا ہے اور دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ بہتر سلوک کر رہا ہے۔ اس کا تمھیں استقبال کرنا چاہیے۔ یہ ہر آواز کے مقابلے میں بہتر آواز ہے، صحیح تر اور پاکیزہ تر آواز ہے اور اسی کو بلند ہونا چاہیے۔ دنیا خاندانوں، قبیلوں اور قوموں کی برتری کا دعویٰ کرتی ہے اور ان کا اقتدار چاہتی ہے اور اپنے مفاد پرست قائدین کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ لیکن اللہ کی اطاعت اور بندگی کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔

میرے بزرگو اور دوستو! وقت آگیا ہے کہ آپ اس پیغام کو لے کر اٹھیں۔ یہاں دعوت کسی شہنشاہ یا کسی سربراہ مملکت، کسی قبیلے اور کسی قوم کی طرف نہیں، بلکہ اللہ کی طرف ہے۔ دنیا کا ہر فرد اللہ کا بندہ ہے اور اسی کا اسے اطاعت گزار ہونا چاہیے۔

میرے بزرگو اور دوستو! نبی عربی محمد ﷺ نے اور آپ کے چند صحابہؓ نے پوری قوت سے یہ آواز بلند کی تھی وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ بتاؤ اس کی بات سے بہتر کسی کی بات ہوسکتی ہے، جو اللہ کی طرف بلا رہا ہے اور بالآخر دنیا اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں مگر یہ آواز کہیں سے بلند نہیں ہورہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کا حوصلہ ہم میں نہیں رہا کہ ہم دنیا سے کہہ سکیں کہ اللہ کی اطاعت اور بندگی سے بہتر کوئی تصور حیات نہیں ہوسکتا۔ ہم میں یہ کہنے کی ہمت نہیں رہی کہ دیکھو نہ میں اپنی ذات کی طرف بلا رہا ہوں، نہ اپنی قوم کی طرف، نہ اپنے قبیلے کی طرف بلا رہا ہوں اور نہ اپنے ملک کی طرف بلکہ پوری نوعِ انسانی کو آواز دے رہا ہوں کہ آؤ اللہ کے بندے بن جاؤ اور اس کی اطاعت کرنے لگو۔

دوستو اور ساتھیو! آپ جانتے ہیں اس دنیا میں مسلمان ایک اندازے کے مطابق ۱۵۰ کروڑ ہیں اور تین درجن سے زیادہ مسلمانوں کی حکومتیں ہیں۔ لیکن کسی میں یہ ہمت اور حوصلہ نہیں ہے کہ کہے وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ ہم دنیا کو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں، بتاؤ اس سے بہتر کوئی فلسفہ اور نقطۂ نظر تمھارے پاس ہے؟ تمھارا ہر فلسفہ اور نقطۂ نظر انسانوں کو گروہوں میں بانٹنے والا، آپس میں لڑانے اور ظلم و زیادتی کرنے والا ہے۔ اسے ختم ہونا چاہیے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی امت اپنے دین پر یقین سے اس قدر محروم اور حریف طاقتوں سے اس قدر دہشت زدہ ہے کہ کہیں سے اسلام کے حق میں آواز بلند نہیں ہورہی ہے۔ آج اس ملک میں آپ پندرہ بیس کروڑ ہیں۔ اگر آدمی شمار کرنا بھی چاہے تو شاید دو ایک گھنٹے لگ جائیں۔ بیس کروڑ کی آبادی ملک کے ہر علاقے اور ہر خطے میں موجود ہے۔ اگر ملک کے گوشے گوشے سے یہ آواز اٹھے: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ ہے کوئی فلسفہ، ہے کوئی حکمت، ہے

کوئی نقطۂ نظر جو اس تصور حیات سے بہتر ہو جو ہم پیش کر رہے ہیں تو میرا خیال ہے اس ملک کا نقشہ بدل جائے گا۔ پندرہ کروڑ انسان اگر یہ آواز بلند کریں اور ہر گوشے سے بلند کریں کہ آؤ اللہ کے بندے بنو۔ اسی میں ہماری اور تمہاری نجات ہے تو پھر ممکن نہیں ہے کہ یہ ملک کسی اور طرف جا سکے اور کوئی اور راستہ اسے دکھایا جا سکے۔ صرف یہی ایک راستہ ہوگا اور اگر نہیں ہوگا تو آپ کی آواز فضا میں گونجتی رہے گی اور اگر آپ کی یا میری جان اس میں چلی جائے تو یہ خوش قسمتی ہے آپ کی بھی، میری بھی۔ قرآن نے اللہ کے بندوں کے بارے میں کہا: فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِيۡلًا ۙ‏ (الاحزاب: ۲۳) انھوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کر دکھایا اور کبھی وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ ہم نے بھی اللہ سے وعدہ کیا ہے۔ اسے پورا ہونا چاہیے۔

میرے دوستو اور ساتھیو! اگر پندرہ بیس کروڑ کی یہ آبادی اللہ کے اس پیغام کو لے کر اٹھے تو کچھ بعید نہیں کہ یہ دنیا آپ کی ہو جائے اور آپ اس کے قائد و رہ نما ہوں، آپ پیچھے چلنے والے نہیں راہ نمائی کرنے والے بن جائیں۔ اس وقت آپ دوسروں کے چشم و ابرو کے اشاروں کو نہیں دیکھیں گے، بلکہ دنیا آپ کی طرف دیکھے گی اور اشاروں پر چلے گی۔

میرے دوستو اور ساتھیو! ہم میں سے کتنے ہیں جن کو یہ معلوم ہے کہ ان کو کیا پیغام دیا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ دنیا کی رہنمائی کریں، آپ اسے بتائیں کہ سیدھا راستہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے بندے بن کر رہیں، اس کے علاوہ ہر راستہ غلط ہے۔ کیا اتنی بڑی آبادی اس کے لیے تیار ہے؟ اگر تیار ہے تو سمجھیے کہ اللہ کا وعدہ بھی پورا ہو کر رہے گا اور اللہ کی نصرت آپ کے شامل حال ہوگی۔ بلاشبہ یہ راستہ کٹھن ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اگر آپ نے یہ آواز بلند کی تو آسانیاں فراہم ہونے لگیں گی، قدم قدم پر رکاوٹیں ہوں گی۔ ضرورت ایسے باہمت انسانوں کی اور

ایسے مردانِ کار کی ہے جو یہ آواز بلند کرسکیں کہ یہی ایک دینِ حق ہے۔ اسی میں تمھاری بھی نجات ہے اور ہماری بھی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم خود اسلام کو سمجھیں، اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم کریں۔ ہم بدل جائیں، ہمارا گھر بدل جائے، ہماری بستی بدل جائے، ہماری سوسائٹی بدل جائے، ہمارے معاملات اس کی روشنی میں حل ہونے لگیں، ہماری پوری زندگی پر اس کی حکم رانی ہونے لگے اور ہم عَمِلَ صَالِحًا کی مکمل تصویر بن جائیں۔

اس کے ساتھ آپ کو اسلام پر پورا شرح صدر ہو۔ آپ فخر کے ساتھ کہہ سکیں اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ میرا تعلق اللہ تعالیٰ کے فرماں برداروں میں سے ہے۔

بزرگو اور دوستو! جی چاہتا ہے ہم میں سے ہر ایک کی زبان پر، ہر گوشے میں، ملک کے ہر حصے میں اور ہر طرف سے یہ آواز بلند ہو کہ نجات دنیا کے کسی طریقۂ حیات میں نہیں ہے۔ نجات ہے تو صرف اللہ کی کتاب میں اور اس کے پیغمبر محمد ﷺ کی راہ نمائی میں۔

آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ یہاں سے خالی ہاتھ نہ جائیں۔ یہ پیغام لے کر جائیں اور یہی نعرہ بلند کرتے رہیں: 'وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ' (اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی، جس نے اللہ کی طرف بلایا)۔

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

☆☆

قرآن کا پیغام انسانیت کے نام

۶؍مئی ۲۰۰۵ء کو جماعت اسلامی ہند حلقہ دہلی و ہریانہ کی جانب سے ''راجندر بھون آڈیٹوریم'' میں ہندی ترجمۂ قرآن کے آڈیو کیسٹ اور سی ڈی کی رسم اجراء کی تقریب تھی۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندومت، سکھ مت اور جین مت کے ماننے والے، یوگا کے قائلین اور مذہبی اسکالر بھی شریک تھے۔ اس موقعے پر اس عاجز نے جو صدارتی تقریر کی تھی اسے کیسٹ سے نقل کرکے نظر ثانی کے بعد یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

بزرگو اور دوستو! آپ بڑی دیر سے قرآن مجید سے متعلق اس پروگرام میں شریک ہیں اور بہت سی باتیں آپ کے سامنے آئی ہیں۔ اس کے باوجود مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ قرآن ایک ایسی عظیم کتاب ہے جس میں آسمان کی رفعت اور سمندر کی گہرائی پائی جاتی ہے، جس کی جڑیں پاتال تک پہنچی ہوئی ہیں اور جس کی شاخیں فضائے عالم میں لہرا رہی ہیں، جس میں بجلی کی چمک، بادل کی کڑک اور آفتاب و ماہتاب کی تابانی ہے۔ یہ وہ نورِ حیات ہے، جس سے ہر طرح کی ظلمتیں کافور ہوجاتی ہیں۔ اس کی تعریف و توصیف میں جو کچھ بھی کہا جائے، جتنا کچھ بھی کہا جائے اور اس کی تعلیمات کی جتنی کچھ بھی توضیح و تشریح کی جائے وہ اصل سے کم ہی ہوگی۔ اس کے بارے میں ہر تحقیق نئی تحقیق کا دروازہ کھولتی ہے۔ یہ گنجینۂ معارف ہے۔ یہ علم کی طلب پیدا کرتی اور اس کی پیاس بڑھاتی ہے۔

میں قرآن مجید کھولتا ہوں تو اس کی پہلی سورت (سورۂ فاتحہ) سامنے آتی ہے۔ یہ سورت بتاتی ہے کہ اللہ کیا ہے، وہ کن صفات کا حامل اور کن کن خوبیوں کا مالک ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق ہے، مجھے اس کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس نے میری ہدایت کا کیا انتظام کیا ہے، کون لوگ ہیں جو اس کے انعام و اکرام کے مستحق ہوں گے اور کون ہیں جو راہِ راست سے بھٹک گئے اور کون اس کے غیظ وغضب کا نشانہ بنیں گے؟ یعنی اس کے پہلے ہی صفحہ میں اللہ تعالیٰ کا تعارف ہو جاتا ہے۔ میں اسے جان بھی جاتا ہوں اور اس سے میرا تعلق بھی قائم ہوجاتا ہے۔ میرا مطالعہ بہت محدود ہے، لیکن میں نے ایسی کوئی کتاب نہیں دیکھی جس میں سات مختصر جملوں یا سات آیات میں یہ پوری بات کہی گئی ہو۔

اس کے بعد قرآن مجید کا دوسرا صفحہ یا اس کی دوسری سورت الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے، جسے آپ اس کا نام کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کے الفاظ پوری شدت سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور مجھے رکنا اور سوچنا پڑتا ہے۔ اس کا آغاز ”ذٰلِکَ الْکِتٰبُ“ سے ہوا ہے۔ یعنی یہ کتاب جو تمھارے ہاتھ میں ہے، یہ کوئی عام کتاب نہیں ہے، یہ کسی دوست کا خط نہیں ہے، یہ کوئی افسانہ اور ناول نہیں ہے، یہ کسی دانشور کی عقلی تگ وتاز اور کسی اسکالر کی تحقیق نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ ان دو لفظوں میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ وہ کتاب ہے، جس کے لیے تمھاری فطرت بے چین ہے، جو تمھارے ہر سوال کا جواب دیتی، تمھارے الجھے ہوئے مسائل حل کرتی اور تمھیں راہِ ہدایت دکھاتی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے، جس کا زمانۂ دراز سے چرچا ہو رہا تھا اور اللہ کے پیغمبر جس کا حوالہ دیتے آرہے تھے۔ یہ الفاظ پڑھتے ہی میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہوجاتی ہے اور ذرا سنجیدگی سے غور کرتا ہوں تو جسم پر رعشہ طاری ہونے لگتا ہے۔ وہ آگے کہتا ہے ”لَا رَیْبَ فِیْہِ“ اس کے اللہ کی کتاب ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ جو لوگ اس کے اس دعویٰ کو تسلیم نہ کریں وہ

چند ہی آیات کے بعد انھیں چیلنج کرتا ہے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے بلکہ محمد ﷺ کی داستان سرائی ہے اور وہ اپنے خیالات کو اللہ کی طرف منسوب کر کے پیش کر رہے ہیں تو تم بھی کوئی ایسی کتاب پیش کرو۔ تم اور تمھارے جھوٹے خدا سب مل کر ایسی کتاب دنیا کے سامنے لاسکتے ہو تو لے آؤ۔ قرآن شریف نے پہلے ہی پارے کے شروع میں جو چیلنج دیا، اسے بار بار اس نے دہرایا ہے۔ اس نے کہا چوں کہ یہ انسان کی کتاب نہیں ہے اس لیے کوئی انسان اس کا جواب فراہم نہیں کرسکتا۔ دنیا میں کسی بھی مصنف اور محقق نے اپنی تصنیف اور تحقیق کو اس چیلنج کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت کی ہے اور نہ کرسکتا ہے کہ اس کی تحقیق لاجواب ہے۔ ایسی تحقیق کسی کے بس میں نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتا ہے کہ وہ اپنی کتاب کے بارے میں اس طرح کا چیلنج کرے۔ چناں چہ دنیا آج تک اس کا جواب فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ یہ اس کے من جانب اللہ ہونے کے بہت سے دلائل میں سے ایک زبردست دلیل ہے۔

اس سے آگے وہ کہتا ہے "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" یعنی اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ کا خوف اور اس کی اطاعت کا جذبہ ہو۔ وہ بعض بنیادی باتوں کو مان کر اپنی زندگی سے اس کا ثبوت فراہم کرنے لگے تو قرآن پوری زندگی کے لیے راہِ ہدایت کھول دے گا اور انسان دن کی روشنی میں اپنا سفرِ حیات طے کرسکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتابِ ہدایت ہے۔ اگر جذبہ صادق مفقود ہے اور ہدایت کی طلب نہیں ہے تو آدمی اس پر ریسرچ کرسکتا ہے، تحقیق کرسکتا ہے، لیکن اس کے ذریعے راہِ ہدایت نہیں پاسکتا۔ وہ ایک ہی جملہ میں اتنی بڑی بات کہتا ہے اور فیصلہ چاہتا ہے کہ اسے اللہ کی کتاب تم مان بھی رہے ہو یا نہیں۔ اس سے ہدایت کے طالب ہو یا نہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو آؤ میں تمھیں تقویٰ اور خدا ترسی کی راہ دکھاؤں۔

دنیا میں جو شخص کسی انقلاب کا داعی اور رہنما ہوتا ہے وہ کسی خاص قوم اور طبقہ کو

خطاب کرتا ہے اور انقلاب کے لیے اسے تیار کرتا ہے۔ وہ مزدوروں یا سرمایہ داروں کو خطاب کرے گا، اس کا خطاب اونچی ذات والوں سے ہوگا یا وہ نیچی ذات والوں کو مخاطب بنائے گا۔ اسی طرح وہ ہندوستان، ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ یا کسی بھی ملک کے باشندوں کو خطاب کرے گا۔ لیکن یہ وہ عظیم انقلابی کتاب ہے، جو اپنے آغاز ہی میں سارے جہاں کے انسانوں کو اپنا مخاطب بناتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کا پیغام دنیا بھر کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ یہ عرب کے لیے بھی ہے عجم کے لیے بھی، ایران کے لیے بھی ہے ہندوستان کے لیے بھی، روم کے لیے بھی ہے، یونان کے لیے بھی، امریکہ کے لیے بھی ہے افریقہ کے لیے بھی، یورپ کے لیے بھی ہے اور ایشیا کے لیے بھی۔ یہ ہر ملک کے ہر طبقے کے لیے اور ہر انسان کے لیے ہے۔ ذرا اس کے ان الفاظ پر غور کیجیے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ:۲۱)	اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو، جس نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور تم سے پہلے کے لوگوں کو بھی۔ امید ہے کہ تم اللہ کی پکڑ سے بچ جاؤ گے۔“

یہ اس حقیقت کا اعلان تھا کہ سارے انسان ایک اللہ کے بندے ہیں، اس اللہ کے جس نے انھیں بھی پیدا کیا اور ان سے پہلے کے لوگوں کو بھی پیدا کیا۔ آدم سے لے کر آج تک جتنے بھی انسان پیدا ہوئے سب اس کی مخلوق اور وہ ان کا خالق ہے۔ اس بات کو مان کر اگر وہ اس کی عبادت اور فرماں برداری کی راہ اختیار کرلیں تو ان کی زندگی ضلالت اور گمراہی سے محفوظ ہوجائے گی۔ ان کے اندر تقویٰ آجائے گا، وہ نیکوکاروں کی زندگی گزار سکیں گے اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔

قرآن کی عظمت کا ایک اور پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر قرآن اس دعوے کے ساتھ سامنے آتا کہ جو بات وہ کہتا ہے دنیا میں کسی نے نہیں کہی

اور جو تعلیمات وہ پیش کرتا ہے وہ کسی نے نہیں پیش کیں تو بھی بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ انسانوں میں دو ایک نہیں لاکھوں کروڑوں، اربوں کھربوں انسان کہنے لگتے کہ قرآن سچ کہتا ہے اور اس کے دعویٰ پر ایمان لے آتے، لیکن کمال ہے قرآن کا، وہ کہتا ہے یہ باتیں جو میں کہہ رہا ہوں پہلے بھی کہی جاتی رہی ہیں۔ ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کوئی نئے رسول نہیں ہیں۔ جو پیغام ان کا ہے اسی پیغام کے ساتھ اور بھی پیغمبر آتے رہے ہیں:

قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (الاحقاف:۹)

اے پیغمبر! آپ ان کو بتادیں کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ قیامت کے روز کیا معاملہ ہوگا اور نہ یہ جانتا ہوں کہ تمھارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

یہ بات ان الفاظ میں بھی کہی گئی ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران:۱۴۴)

محمد تو بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔

دنیا میں کتنے رسول آئے، کہاں آئے اور کس دور میں آئے اس کی تفصیل دشوار ہے۔ البتہ قرآن کہتا ہے کہ ہر قوم میں اللہ کے رسول آئے:

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (فاطر:۲۴)

کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جس کے اندر کوئی ڈرانے والا (یعنی رسول) نہ گزرا ہو۔

قرآن مجید میں ان میں سے صرف چند رسولوں کا ذکر ہوا ہے، سب کا نہیں:

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِکَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْکَ (المومن:۷۸)

ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض وہ بھی ہیں، جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا ہے۔

قرآن پورے زور سے کہتا ہے کہ جو دین آج محمد ﷺ پیش فرما رہے ہیں وہ

اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان اللہ کا بندہ ہے اور سب کو اسی کی بندگی کرنی چاہیے، کسی بھی شخص کے لیے چاہے وہ کسی بھی حیثیت میں ہو، کوئی بھی منصب رکھتا ہو، مرد ہو یا عورت، اس کی کوئی بھی جنس ہو، اس سے سرتابی جائز نہیں ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کے ان تمام نیک بندوں کی تعلیم رہی ہے جنھیں اس نے اپنے رسولوں کی حیثیت سے اپنی اپنی قوم میں مبعوث فرمایا۔ قرآن کا یہ تاریخی بیان اس قدر مبنی بر حقیقت اور معقول ہے کہ کوئی بھی سمجھ دار انسان اس کا انکار نہیں کرسکتا، اس لیے کہ اگر اس کائنات کا ایک اللہ ہے اور اسی کی بندگی ہونی چاہیے تو یہی بات اس کے ہر پیغمبر نے لازماً کہی ہوگی۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری بات اس کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتی۔

اب آپ ایک سوال کرسکتے ہیں۔ وہ یہ کہ اگر سارے پیغمبروں کی ایک ہی تعلیم تھی اور سب ایک ہی بات کہتے رہے ہیں تو محمد ﷺ کی بعثت کی کیا ضرورت تھی؟ اگر آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک سب نے ایک ہی بات کہی اور ایک ہی دین کی دعوت دی تو آخر محمد ﷺ کو رسول بنا کر کیوں بھیجا گیا؟ قرآن اس کا یہ جواب دیتا ہے اور بہت صراحت کے ساتھ دیتا ہے کہ دنیا میں جتنے رسول آئے بے شک ان سب کا ایک ہی دین تھا اور ان کی تعلیمات بھی ایک ہی تھیں، لیکن وہ صحیح شکل میں محفوظ نہیں رہیں۔ قرآن کا یہ بیان ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی تردید کی کوئی شخص جرأت نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید سے پہلے آسمانی کتابوں میں سب سے آخر میں حضرت عیسیٰؑ کو انجیل عطا کی گئی تھی، جسے New Testament کہا جاتا ہے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے سنی گئی؟ کیا اس کے الفاظ وہی ہیں جو حضرت عیسیٰ نے ادا فرمائے تھے۔ آج تو خود عیسائی دنیا میں یہ بحث ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان کون سی تھی اور جس زبان میں انھوں نے خطاب کیا تھا وہ اب بھی کوئی زندہ زبان ہے؟ موجودہ انجیل حضرت عیسیٰ کے بہت بعد مرتب ہوئی، اس لیے اس طرح کے سوالات کا قطعی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ حضرت عیسیٰؑ سے بارہ تیرہ سو سال قبل حضرت موسیٰؑ

نے توریت پیش کی تھی۔ وہ بھی اپنے اصل الفاظ میں نہیں پائی جاتی۔ اس لیے کہ یہ بہت بعد میں مرتب ہوئی۔ اس کے مرتب کون تھے اور ان کے حالات کیا تھے۔ انھوں نے توریت ایک عرصہ کے بعد کس طرح مرتب کی، یہ ساری باتیں ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ خود حضرت موسیٰ کی سوانح حیات بھی پوری طرح محفوظ نہیں ہے۔ان کے علاوہ دیگر آسمانی صحیفوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ محفوظ ہیں۔ لیکن قرآن کا معاملہ یہ ہے کہ جس اللہ نے یہ کتاب نازل کی اسی نے یہ وعدہ بھی فرمایا کہ یہ قیامت تک جوں کی توں محفوظ رہے گی:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۝ (الحجر:۹)

ہم نے یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

یہ کتاب محمد ﷺ نے جس طرح پڑھی اور تلاوت کی آپ کے ساتھیوں نے ایک لفظ کے فرق کے بغیر اسی طرح اسے پڑھا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں وہی قرآن پڑھتا ہوں جو محمد ﷺ کی زبان مبارک سے سنا گیا۔ اس کے ساتھ یہ کتاب پوری کی پوری حفظ کی جاتی رہی۔ دنیا میں اس کی کوئی مثال نہ پہلے تھی اور نہ آج ہے کہ اتنی ضخیم کتاب دو ایک افراد نہیں ہر دور میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہو اور اسے بے تکلف از اول تا آخر وہ سنا سکتے ہوں۔ اس کا تھوڑا بہت حصہ تو ہر اس مسلمان کو جو نماز پڑھتا ہے لازماً حفظ ہوتا ہے۔ یہ اہتمام کسی دوسری مذہبی کتاب کے ساتھ دیکھنے میں نہیں آیا۔

اس کے ساتھ اول روز سے اس کی کتابت کا بھی اہتمام ہوتا رہا ہے۔ قرآن مجید نہ صرف حفظ کیا جاتا بلکہ اسے تحریری طور پر محفوظ بھی کیا جاتا تھا۔ دورِ نبوت سے لے کر آج تک اس کے ہزاروں نہیں لاکھوں ایڈیشن چھپ رہے ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں چھپ رہے ہیں، ہندوستان میں چھپ رہے ہیں، پاکستان میں چھپ رہے ہیں، عرب دنیا میں چھپ رہے ہیں، امریکہ و یورپ میں چھپ رہے ہیں اور ہزاروں برس

سے چھپ رہے ہیں۔ وہ نسخے بھی دریافت ہو چکے ہیں جو آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد والوں نے لکھے تھے، ان میں اور دنیا میں کہیں بھی چھپنے والے کسی بھی نسخہ میں ایک لفظ بلکہ ایک شوشہ کا فرق آپ نہیں پائیں گے۔ حجاز میں جو قرآن مجید چھپ رہا ہے وہی قرآن مجید نول کشور کے مکتبہ سے چھپتا ہے۔ دونوں میں ذرہ برابر فرق و اختلاف آپ نہیں دیکھیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اب کوئی آسمانی کتاب محفوظ نہیں ہے، صرف وہ محفوظ ہے۔

قرآن نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انسانوں کو جو راہ ہدایت دکھائی تھی وہ زمانہ گزرنے کے ساتھ گم ہوگئی اور ان کی تعلیمات میں اس طرح تحریف ہوتی چلی گئی کہ صحیح باتوں کے ساتھ غلط باتیں بھی ان میں در آئی ہیں، بلکہ زیادہ تر غلط باتیں ان کی طرف منسوب ہوگئی ہیں۔ قرآن کا دنیا پر ایک بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی صحیح تعلیمات کو اس نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور غلط باتوں کو خارج کر دیا ہے۔ اس نے ان کی بعض تحریفات کی نشان دہی اور ان کی تصحیح بھی کی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ملی تھی، حضرت نوحؑ کو اس نے ان ہدایات سے نوازا تھا، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ کو یہ تعلیمات عطا کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ دوسرے پیغمبروں کی یہ تعلیم تھی۔ اس کے خلاف جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ غلط اور بے بنیاد ہیں، ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہے کہ اللہ کا دین ہمیشہ سے کیا رہا ہے اور اس کے پیغمبروں کی کیا تعلیم تھی تو اسے قرآن ہی سے معلوم کرنا ہوگا اور قرآن پر ایمان لانا ہوگا۔

قرآن مجید نے یہ بات بھی صراحت کے ساتھ کہی ہے کہ دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ اپنے اپنے دور کے لیے، اپنے اپنے زمانے کے لیے آئے۔ اپنے وقت میں انھوں نے بہترین خدمات انجام دیں، اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا، اس کی بندگی اور اطاعت کی دعوت دی۔ کوئی پیغمبر عراق میں، کوئی شام میں، کوئی فلسطین میں اور کوئی حجاز

میں آیا۔ اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کے پیغمبر ہندوستان، چین اور دنیا کے دوسرے ملکوں اور خطوں میں بھی آئے ہوں گے، لیکن یہ سب ایک محدود وقت کے لیے آئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کا Relevance ختم ہوگیا۔ اب ایک ایسے پیغمبر کی ضرورت تھی، جس کی تعلیم عالمگیر ہو، قیامت تک کے لیے ہو، ہر ملک اور ہر خطہ کے انسانوں کے لیے ہو۔ اسی لیے محمد ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ سارے عالم کے لیے رسول بنائے گئے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (الاعراف:۱۵۸)

اے نبی! کہہ دیجیے، اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ وہ اللہ جس کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت حاصل ہے۔

قرآن ایک طرف اللہ کی طرف سے آئے ہوئے تمام پیغمبروں کو تسلیم کرتا، ان کی حقیقی تعلیمات کو پیش کرتا اور نوعِ انسانی پر ان کے احسانات کا ذکر کرتا ہے۔ ان سب پر ایمان کو وہ ضروری قرار دیتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اللہ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے آنے کے بعد پہلی سب کتابیں منسوخ ہوگئیں۔ اس لیے اب اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

قرآن مجید سے پہلے توریت اور انجیل موجود تھی۔ ان کتابوں کو قرآن آسمانی کتاب مانتا اور ان کے ماننے والوں کو صراحت کے ساتھ اہل کتاب قرار دیتا ہے۔ دنیا کے بڑے علاقے پر ان کی حکومت بھی تھی۔ اس سب کے باوجود اس نے ان سے خطاب کرکے کہا:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآئَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝

اے اہلِ کتاب تمھارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے۔ وہ کتاب (توریت) کی ان بہت سی باتوں کو ظاہر کر رہا ہے، جنھیں تم چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں کو نظر انداز بھی کر رہا ہے۔ بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف

يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○ (المائدۃ:۱۵،۱۶)

سے نور اور واضح کتاب آچکی ہے۔ اللہ اس کے ذریعے ان لوگوں پر جو اس کی مرضی کی اتباع کریں، سلامتی کی راہیں کھولتا ہے اور انھیں اپنے حکم سے ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور انھیں صراطِ مستقیم دکھاتا ہے۔

یہ جواب ہے اس بات کا کہ توریت اور انجیل کے ہوتے ہوئے قرآن کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ کتابیں آج اپنی حقیقی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ قرآن مجید نے ان کی بعض نمایاں تحریفات کی نشان دہی کرکے ثابت کر دیا ہے کہ ان کو کتاب محفوظ کا مقام حاصل نہیں ہے۔ انسانی ترمیمات نے اس چشمۂ صافی کو گدلا کر دیا ہے، اس لیے ہدایت و رہنمائی کے لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اب اللہ کی آخری کتاب آچکی ہے جو پوری طرح محفوظ ہے۔ اب یہی واحد سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو جو قومی اور مذہبی تعصّبات سے بلند ہوکر صرف اس کی رضا کا طالب ہو، اس کتاب کے ذریعے امن و سلامتی کی راہ دکھائے گا اور اسے ظلمتوں سے نکال کر نورِ ہدایت عطا کرے گا۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ سارے مذاہب ایک ہی راہ دکھاتے ہیں اور ایک ہی منزل تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کا، جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں، حوالہ دیتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب جھوٹ، فریب، خیانت، بدعہدی، ظلم و ناانصافی کی تائید نہیں کرتا۔ کوئی مذہب یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ بولنا، چوری کرنا اور کسی کا مال لوٹ لینا اچھا ہے۔ کسی نے دھوکہ فریب، خیانت اور بدعہدی کی تائید نہیں کی ہے۔ سب ہی کے نزدیک کسی کی عزت و آبرو سے کھیلنا اور کسی بے گناہ کی جان لینا پاپ کا کام اور گناہ کا باعث ہے۔ ہر مذہب صداقت اور راست بازی، دیانت و امانت، عفت و عصمت اور جان و مال کے احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اخلاق کا درس مذہب کی تعلیم کا ایک لازمی حصہ رہا ہے۔ قرآن نے بھی ان اخلاقیات کی تعلیم دی ہے اور پرزور طریقے سے دی ہے، لیکن اس سے پہلے وہ اللہ کے

وجود، اس کی وحدانیت، وحی و رسالت اور آخرت پر ایمان کو ضروری قرار دیتا ہے۔ ان بنیادی حقائق کے انکار کے بعد آدمی اخلاق کا پابند ہو بھی جائے تو وہ اس کے نزدیک فلاح کا مستحق نہ ہوگا۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ان حقائق پر ایمان کے بعد ہی صحیح معنوں میں اخلاق پر عمل ہوسکتا ہے۔ ایک آدمی کبھی سچ اس لیے بولتا ہے کہ اس میں اپنا ذاتی فائدہ دیکھتا ہے، کبھی فوری فائدہ کی جگہ مستقبل کا فائدہ اسے نظر آتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ اگر اس وقت میں سچ بولوں تو تھوڑا سا نقصان برداشت کرنا ہوگا، لیکن آئندہ بڑے فائدے کی توقع ہے۔ کبھی اس لیے سچ بولتا ہے کہ اس میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ تو نہیں ہوتا لیکن اس کے گھر اور خاندان والوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس سے اوپر اٹھ کر کبھی وہ قوم کے فائدے کے لیے صداقت کا اظہار کرتا اور اس کے لیے نقصان برداشت کرتا ہے، لیکن جہاں ان میں سے کوئی فائدہ پیش نظر نہ ہو تو اس کے لیے سچائی کا محرک باقی نہیں رہتا اور اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر اللہ اور رسول پر اس کا ایمان ہو اور وہ ان کی اطاعت وفرماں برداری کو اپنے لیے لازم قرار دیتا ہو اور اس کے دل و دماغ میں یہ یقین جاگزیں ہو کہ ایک دن اسے اپنے عمل کا جواب دینا ہے تو وہ ہمیشہ اور ہر حال میں سچائی کا پابند رہے گا۔ نفع یا نقصان کوئی چیز اسے صداقت اور راستی سے نہ ہٹا سکے گی۔

قرآن مجید کا ایک خاص پہلو جو آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ اس کا Aproach ہے۔ وہ جب قرآن پڑھتا ہے تو صاف دیکھتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے دلیل کے ساتھ کہتا ہے، بے دلیل کوئی بات نہیں کہتا، وہ مختلف مسائل میں اپنا موقف بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے خلاف اگر تمھارے پاس کوئی دلیل ہو تو پیش کرو۔ دلیل کا جواب دلیل سے ہونا چاہیے۔ بغیر دلیل کے اسے رد کر دینا نامعقولیت ہے۔ چناں چہ وہ جگہ جگہ کہتا ہے:

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (البقرۃ:۱۱۱)	(اے پیغمبر ان سے) کہو کہ تم اگر اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔

قوموں کی تاریخ میں بعض اوقات ان کی قدیم روایات (Customs) بڑی اہمیت اختیار کرلیتی ہیں۔ وہ انھیں اپنی پہچان سمجھنے لگتی ہیں اور کسی قیمت پر ان سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھی تو ان روایات کو قانون کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے جس کی خلاف ورزی کی کوئی شخص ہمت نہیں کر پاتا۔ مذہب کی روایات تو اس کے ماننے والوں کے نزدیک حق وصداقت کا اصل معیار بن جاتی ہیں۔ وہ ان میں کسی غلطی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ ہر چیز کو باپ دادا کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر حق وناحق کا فیصلہ کرتے ہیں۔ قرآن نے کہا قومی اور مذہبی روایات الگ ہیں اور حق وصداقت ان سے بالکل الگ ہے۔ حق ہر چیز پر مقدم ہے۔ اگر یہ روایات حق کی میزان پر پوری اترتی ہوں تو وہ سر اور آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں، ورنہ انھیں رد کردینا چاہیے۔ یہ کوئی دانش مندی نہیں ہے کہ آدمی روایات کے پیچھے حق کو ٹھکرائے اور ضلالت وگمراہی میں بھٹکتا پھرے۔ اس نے مذہب کے روایت پرستوں کے بارے میں کہا:

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ○ (البقرۃ:۱۷۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو دین نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم اس طریقے کی اتباع کرتے ہیں، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ کیا یہ باپ دادا کی اتباع کریں گے، چاہے وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہِ ہدایت پر ہوں۔

اہل عرب کے نزدیک بھی باپ دادا کے طریقوں کی بڑی اہمیت تھی۔ انھیں وہ سراسر حق سمجھتے تھے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ باپ دادا سے بھی غلطی ہوسکتی ہے۔ قرآن نے ان کے اس جاہلانہ رویے کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ اس سے ان کے ذہن اور نفسیات کا پتہ چلتا ہے اللہ کے پیغمبروں کی طرف سے اس کا جواب یہ تھا:

قٰلَ اَوَ لَوۡ جِئۡتُكُمۡ بِاَهۡدٰى مِمَّا وَجَدۡتُّمۡ عَلَيۡهِ اٰبَآءَكُمۡ. (الزخرف:۲۴)

پیغمبر نے کہا کہ اگر میں تمھارے پاس تمھارے باپ دادا کے طریقے سے بہتر طریقہ لے آؤں تو کیا پھر بھی تم اس کا انکار کروگے۔

مطلب یہ کہ میں تمھارے سامنے ایک بہتر اور معقول بات رکھ رہا ہوں۔ کیا تم اسے محض اس وجہ سے رد کر دوگے کہ وہ تمھارے قدیم طریقوں یا روایات کے خلاف ہے؟ لیکن ان روایات پرستوں نے ایک صحیح نظام فکر وعمل کو جو اپنی پشت پر دلیل و برہان کی قوت رکھتا تھا رد کر دیا اور اپنی روایات پر جمے رہے۔ ان کا جواب تھا:

قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ انھوں نے کہا جو دین دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ (الزخرف: ۲۴)

اس طرح قرآن ہمارے سامنے اس حیثیت سے آتا ہے کہ وہ کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ اللہ کی کتاب ہے۔ کوئی بھی فرد بشر بلکہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس جیسی کتاب نہیں پیش کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا، وہی ان کا خالق اور پروردگار ہے۔ اس نے ان سب کی ہدایت کے لیے یہ کتاب نازل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغمبر آئے اور جو کتابیں نازل ہوئیں ان میں سے کسی کی تعلیم اب اپنی صحیح شکل میں باقی نہیں ہے۔ صرف قرآن مجید ہی واحد کتاب ہے جو پوری طرح محفوظ ہے۔ اسی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وہ عقیدے کے معاملے میں جبر کا قائل نہیں ہے۔ وہ اپنی بات دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ کسی کو اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ یہ ہے قرآن کا موقف! اس سے اختلاف کا تو آدمی کو حق ہے لیکن اس کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ علی گڑھ۔ جنوری، مارچ ۲۰۰۶ء)

قرآن مجید کی عظمت اور اس کے مطالعہ کے بعض پہلو

دین کی بنیاد قرآن مجید پر ہے اور سنتِ رسول اس کی تشریح ہے۔ یہی دو ذرائع ہیں جن سے دین کی تعلیمات حاصل ہوتی ہیں، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دینی مدارس میں (اور عام لوگوں کے درمیان میں بھی) مختلف امور و مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ان مآخذ ہی کو عملاً آخر میں رکھا جاتا ہے اور انسانی افکار و نظریات، کلامی مباحث، فقہی آراء، شخصی اجتہادات اور ان کی تفصیلات، قرآن و سنت پر غالب آجاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کو تبدیل ہونا چاہیے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، اور دین کے کسی بھی پہلو پر غور و فکر ہو سب سے پہلے ہمارے سامنے کتاب و سنت کی تعلیمات ہونی چاہئیں۔ اسی سے ہمارے مطالعے کا رُخ صحیح ہوگا۔

قرآن کی عظمت

قرآن مجید دنیا کی عظیم ترین کتاب ہے۔ اس کو ہاتھ میں لینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی عظمت محسوس کی جائے۔ اس کے بغیر صحیح معنی میں نہ تو اس کی طرف توجہ ہوسکتی ہے اور نہ اس سے استفادہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ خود قرآن مجید

میں مختلف مناسبتوں سے اس کی عظمت کا بیان ہے۔ اس کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ اس کی طرف توجہ ہو۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ○ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ○ (البروج:۲۱،۲۲)	بلکہ وہ تو باعظمت قرآن ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

یہ سورۂ بروج کی آیات ہیں جو مکے میں نازل ہوئیں۔ ان میں اہلِ مکہ سے کہا گیا ہے کہ قرآن سے تمھاری بے توجہی، اسے مذاق کا موضوع بنانا، اسے من گھڑت قرار دینا، جس ہستی پر یہ قرآن نازل ہو رہا ہے اس پر اور اس کے ساتھیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنا تمھارے لیے سخت تباہ کن ہے۔ یہ کوئی انسانی کلام نہیں، بلکہ خدا کا کلام ہے جو آسمان کی بلندی سے اور لوحِ محفوظ سے نازل ہوا ہے۔اس کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا جائے گا وہ بڑے دور رس نتائج کا حامل ہوگا۔

سورۂ سجدہ شروع ہی ان آیات سے ہوتی ہے:

الٓمّٓ○ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ○ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ○ (السجدۃ:۱-۳)	الٓمّٓ۔ اس کتاب کا نزول، کوئی شک نہیں کہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اسے (پیغمبر) نے اپنے دل سے گھڑلیا ہے، بلکہ وہ تو تمھارے رب کی طرف سے سچی کتاب ہے، تاکہ تم اس قوم کو ڈراؤ جس کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ شاید وہ سیدھی راہ پائیں۔

مطلب یہ کہ یہ کتاب کسی انسان کا خطاب نہیں، بلکہ خدا کا کلام ہے۔ اس کے حق میں اتنے دلائل ہیں کہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا برحق ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس کا نزول ایک عظیم مقصد کے تحت

ہوا ہے۔ وہ یہ کہ ایک ایسی قوم کو اس کے انجام سے آگاہ کیا جائے جو غفلت میں پڑی ہوئی ہے اور جس کے درمیان صدیوں سے اللہ کی طرف سے کوئی نذیر نہیں آیا ہے۔ یہ اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے۔ اسے وہ قبول کرے گی تو ہدایت پائے گی اور دنیا و آخرت کی فلاح سے ہم کنار ہوگی۔ اسے رد کرے گی تو ضلالت میں بھٹکتی رہے گی اور ہدایت سے محروم قومیں جس بھیانک انجام سے دوچار ہوتی رہی ہیں اس سے یہ بھی دو چار ہوگی۔

سورہ رحمٰن بھی مکی سورہ ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ — رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔

(الرحمٰن: ۱-۲)

یعنی خدائے رحمٰن کی رحمت کے مظاہر چاروں طرف موجود ہیں۔ اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ اس نے قرآن نازل کیا ہے۔ اگر انسان کو سب کچھ مل جائے جو وہ چاہتا ہے اور قرآن نہ ملے تو وہ دنیا کا محروم ترین انسان ہوگا۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ کی رحمت کا اولین تقاضا یہ تھا اور ہے کہ اس نے تمھاری ہدایت کے لیے قرآن نازل کیا۔

قرآن مجید کی مکی سورتوں میں یہ پہلو بہت اجاگر نظر آتا ہے۔ قرآن کی عظمت کا بیان بار بار اس لیے ہے کہ آدمی کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے کہ قرآن معمولی کتاب نہیں ہے، اس کے ساتھ اس کے شایانِ شان رویہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ اس کی عظمت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم ہر معاملے میں اسے مقدم رکھیں، اسے حرف آخر سمجھیں اور اس کی ہدایات سے ایک قدم تجاوز نہ کریں۔

قرآن مجید کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آسمانی کتابوں میں صرف قرآن مجید 'کتاب محفوظ' ہے۔ اس کی حفاظت کی ذمے داری خود اس کے نازل کرنے والے نے لی ہے۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۝ (الحجر:۹)

بے شک ہم نے یہ ذکر اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی اس طرح حفاظت کی ہے کہ وہ اپنی اصل شکل میں ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں کسی رُخ سے باطل کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہوئی ہے اور نہ تا قیامت ہوسکتی ہے۔

وَ اِنَّہٗ لَکِتٰبٌ عَزِیۡزٌ۝ لَّا یَاۡتِیۡہِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ لَا مِنۡ خَلۡفِہٖ ؕ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ۝ (حٰمٓ السجدۃ:۴۱-۴۲)

اور وہ کتاب ہے بڑی طاقت والی۔ باطل اس میں اس کے آگے سے داخل ہوسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ وہ اس خدا کی نازل کردہ ہے، جو حکمت والا اور ستودہ صفات ہے۔

اس وقت دنیا میں کوئی ایسی آسمانی کتاب نہیں ہے، جسے 'کتابِ محفوظ' کہا جاسکے۔ انسانی تحریفات نے ان کو اس طرح بدل دیا ہے کہ اصل کتاب کا معلوم کرنا ممکن نہیں رہا۔ اب صرف قرآن مجید ہی اللہ کی ذات و صفات اور اس کی مرضی کو خود اس کے الفاظ میں جاننے کا واحد مستند ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعہ آدمی پورے اطمینان سے معلوم کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کن صفات کا حامل ہے، اس کی آخری تعلیم کیا ہے اور کس معاملے میں وہ کیا ہدایات دیتا ہے۔ اس اطمینان کا سوائے قرآن مجید کے اور کوئی طریقہ نہیں رہ گیا ہے؟

قرآن مجید کوئی عام کتاب نہیں ہے کہ آدمی سرسری طور پر اسے پڑھ لے اور رکھ دے۔ دل و دماغ پر اس کے اثرات نہ محسوس ہوں۔ آدمی اگر صحیح معنی میں قرآن کی تلاوت کرے تو اس کے قلب پر لازماً اس کا اثر ہوگا۔ اس

پیمانہ پر ہونی چاہیے اور فارغین مدارس کو عربی زبان پر جتنی قدرت ہونی چاہیے اس میں مختلف اسباب کی بنا پر کمی آتی جارہی ہے۔اب بہت ہی کم طلباء سے اس کی توقع کی جاتی ہے کہ عربی زبان میں انھیں مہارت حاصل ہوگی اور وہ قرآن اور متعلقات قرآن سے براہِ راست استفادہ کرسکیں گے۔ اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

۲- قرآن مجید کو اس طرح پڑھنا چاہیے، جیسے اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ اسی وقت آدمی اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جو لوگ اللہ کی کتاب اس طرح پڑھتے ہیں ان کی تعریف کی گئی ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰـھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (البقرۃ:۱۲۱)

وہ جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسے اس کی تلاوت کا حق ہے۔ یہی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ بات اہلِ کتاب کے حق پرست اصحاب کے متعلق کہی گئی ہے کہ وہ توریت یا انجیل کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح اسے پڑھنا چاہیے۔ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں) کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو صحیح معنی میں اہل ایمان ہیں وہی اللہ کی کتاب کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہی لوگ قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی کتاب کا حق ادا ہوتو آدمی پر راہ ہدایت کھلتی ہے۔

۳- قرآن مجید کی کما حقہ تلاوت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس پر عمل کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ بات سورۂ عنکبوت کی ایک آیت سے سمجھ میں آتی ہے۔ ارشاد ہے:

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ○ (العنکبوت:۴۵)	پڑھو اس کتاب کو جس کی تمہاری طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کرو۔ بے شک نماز بے حیائی سے اور منکر سے روکتی ہے۔ اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

اس آیت میں پہلے تلاوت کتاب کا حکم دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد کہا گیا 'نماز قائم کرو' یہ بظاہر تلاوتِ کتاب کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی نماز قائم کرے اور اللہ کے سامنے جھک جائے۔ اس کے بعد نماز کے اثرات کا ذکر ہوا کہ اس سے زندگی میں پاکیزہ اور صالح تبدیلی رونما ہوگی۔ وہ فحش اور بیہودہ کاموں سے باز رکھے گی، اس لیے کہ نماز اللہ کے ذکر کا نام ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ کسی دل میں رچ بس جائے تو اس سے بھلائیوں کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔

۴- توحید، رسالت اور آخرت قرآن مجید کے مرکزی موضوعات ہیں۔ قرآن کے طالب علم کو یہ جاننا چاہیے کہ توحید پر قرآن کیوں زور دیتا ہے اور اس نے اس کے حق میں کیا دلائل دیے ہیں؟ وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ توحید کو ماننے کے بعد رسالت اور آخرت کا ماننا ضروری ہے؟ ان میں باہم کیا رشتہ ہے؟

۵- قرآن کا ایک خاص موضوع سیرت اور اخلاق ہے۔ اس نے بہت تفصیل سے اخلاق کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کے مطالعہ میں اس پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ قرآن اخلاق پر کیوں زور دیتا ہے؟ اس پر وہ کس طرح معاشرے کی تعمیر کرتا اور فرد اور سماج کو کیسے اس کا پابند بناتا ہے؟ اسلام کی اخلاقی تعلیم پر صحیح معنیٰ میں عمل ہو تو اس سے نہ صرف فرد کی زندگی اعلیٰ کردار سے آراستہ ہوگی، بلکہ معاشرے میں بھی زبردست اخلاقی تبدیلی رونما ہوگی۔

کی تاثیر کا یہ عالم ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الحشر:۲۱)	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور اللہ کے خوف سے پھٹ پڑتا۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔

مطلب یہ کہ یہ کتاب کسی پہاڑ پر نازل کی جاتی تو وہ اس کے خوف سے جھک جاتا، پھٹ پڑتا اور شق ہو جاتا، اس کی بلندی اور اس کی چٹانوں کی سختی باقی نہ رہتی۔ اب یہی کتاب تمھیں دی گئی ہے۔ اس کے اثر سے تمھیں بھی خدا کے سامنے جھک جانا چاہیے۔ جس کلام سے پہاڑ پھٹ جاتے اور جھک جاتے وہی چیز تمھارے ہاتھ میں دی جا رہی ہے، لیکن افسوس کہ تم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے؟

ایک دوسری جگہ فرمایا:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ (الزمر:۲۳)	اللہ نے بہتر بات نازل کی ہے۔ ایسی کتاب جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اور دہرائے گئے ہیں۔ جس سے ان لوگوں کے بدن کانپ جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم پڑجاتے ہیں۔ یہ اللہ کی دی ہوئی ہدایت ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے اللہ گم راہ کردے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہے۔

یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ دل میں خدا کا خوف ہو تو قرآن مجید کی تلاوت سے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور آدمی کا ظاہر ہی نہیں باطن

بھی خدا کے سامنے جھک جاتا ہے اور وہ اسے یاد کرنے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو اللہ کی ہدایت قرار دیا گیا ہے۔ آدمی اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ اسے یہ ہدایت کس حد تک نصیب ہوئی ہے؟

قرآن نے حق پرست اہل کتاب کے بارے میں کہا:

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (المائدۃ:۸۳)	جب وہ اس کتاب کو سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوئی ہے تو تم دیکھوگے کہ ان کی آنکھیں آنسو سے ابل پڑی ہیں اس وجہ سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کو سننے کے بعد آنکھوں سے آنسو کا جاری ہونا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کو عرفانِ حق حاصل ہورہا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ کے بعض پہلو

اب قرآن مجید کے مطالعے کے سلسلے کی بعض باتیں پیش کی جا رہی ہیں:

۱- قرآن مجید عربی زبان میں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے عربی سے معمولی واقفیت کافی نہیں ہے، بلکہ اس پر اچھی قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر اس سے پورا فائدہ اٹھایا نہیں جاسکتا۔ قرآن مجید کے ایک ایک پہلو پر ہمارے اسلاف نے بہت تفصیل سے اور باریک بینی سے غور کیا ہے۔ اس کا بڑا حصہ عربی زبان ہی میں ہے۔ عربی زبان سے واقفیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی اس ذخیرہ سے براہ راست فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہمارے مدارس اور علماء کی توجہ الحمد للہ اس طرف ہے۔ وہ اپنے تلامذہ میں عربی زبان و ادب کی اتنی صلاحیت پیدا کرنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں کہ وہ قرآن مجید سے براہِ راست استفادہ کرسکیں اور جہاں فہم قرآن میں دشواری پیش آئے لغت اور تفسیر کی کتابوں کے ذریعے اسے حل کرسکیں۔ لیکن یہ کوشش جس بڑے

۶- قرآن میں بہت سے احکامِ شریعت موجود ہیں۔ ان میں عبادات ہیں، خاندانی نظام ہے، حدود و تعزیرات ہیں، قانون اور سیاست ہے۔ آج ان قوانین شریعت پر طرح طرح کے سوالات بلکہ اعتراضات ہیں۔ قرآن کے مطالعہ میں آج کی دنیا کا یہ رویہ ہمارے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ قرآن کے احکام سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کا مطالعہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کے احکام کی حکمت اور معنویت واضح ہو اور ان پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا معقول جواب دیا جاسکے۔ یہ وقت کا ایک علمی اور فکری تقاضا ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۷- قرآن کے دلائل ایک طرح کے نہیں ہیں۔ آفاقی بھی ہیں اور انفسی بھی۔ اس نے کہا ہے:

وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ○ (الذاریات:۲۱)	تمھاری ذات کے اندر اس نے دلائل رکھے ہیں، کیا تم نہیں دیکھتے۔

اسی طرح قرآن بتاتا ہے کہ قومیں کس طرح عروج پاتی یا زوال پذیر ہوتی ہیں؟ اس کے کچھ قواعد ہیں، ان پر غور کرو۔ اسبابِ عروج کی پابندی کروگے تو ترقی کروگے، ورنہ زوال تمھارا مقدر ہوگا۔ ان دلائل کو واضح کرنا آج کے دور میں قرآن کی بہت بڑی خدمت ہے۔ ان سے اس کی حقانیت واضح ہوتی ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ بڑی تیاری چاہتا ہے۔ قرآن مجید کے کم ہی طالب علم ہوں گے جو ان پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔

۸- قرآن مجید کا ایک وصف خاص یہ ہے کہ وہ انسان کو گوشہ گیر ہونے اور اپنی جگہ بے دست و پا بن کر بیٹھے رہنے نہیں دیتا، بلکہ اسے اللہ کے دین کے لیے متحرک کردیتا ہے۔ چنانچہ قرآن جب نازل ہونا شروع ہوا تو جو

لوگ اس پر ایمان لائے وہ سب سرگرم عمل ہوگئے اور اللہ کے دین کو قبول کرتے ہی اس کی تبلیغ و اشاعت میں لگ گئے۔ خود بدلے اور پورے سماج کو بدلنے کی کوشش شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت ہی مختصر سی مدت میں معاشرے کے مختلف سطح کے افراد اور طبقات میں اللہ کا دین پوری طرح جلوہ گر ہوگیا۔ ایک طویل عرصہ سے امت کی دین سے وابستگی بہت کم زور ہے۔ اس کا دعوت و تبلیغ کا جذبہ تو اور بھی سرد پڑ گیا ہے۔ قرآن مجید نے امت کی اصلاح و تجدید کی تدابیر تفصیل سے بتائی ہیں۔ ایک طالب علم کو دیکھنا چاہیے کہ یہ تدابیر کیا ہیں اور کس طرح انھیں روبہ عمل لایا جاسکتا ہے؟

۹- قرآن مجید انسان کے فکر و عمل کو بے راہ روی سے بچاتا، غلط جذبات و محرکات سے پاک کرتا اور راہِ راست دکھاتا ہے۔ فرد کی اصلاح و تربیت ایک مشکل کام ہے۔ اسلام نے اسے بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس کے ساتھ وہ ایک خاص رخ سے پورے معاشرے کی تعمیر چاہتا ہے۔ اجتماعی اور سیاسی معاملات کے سلسلے میں اصولی ہدایات فراہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے اور کن طریقوں سے اجتناب کیا جائے، تاکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صالح انقلاب آئے۔ آج دنیا کو اسی صالح انقلاب کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید کا مطالعہ اسی رخ سے ہونا چاہیے۔ یہ دنیا کو ایک نئے نظام فکر و عمل کی دعوت ہے۔ یہ کام قرآن کی راہنمائی میں ہی انجام پاسکتا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان پر مزید غور کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

تقویٰ کی زندگی

۲۴، ۲۵ر نومبر ۲۰۰۴ء کو جامعہ دار السلام عمر آباد میں اساتذہ کا دو روزہ تذکیری اجتماع تھا۔ اس میں اس عاجز کا مذکورہ بالا عنوان پر خطاب ہوا۔ اسی کو نظر ثانی کے بعد یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

تقویٰ کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ طرح طرح کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ظاہری اعمال میں شریعت کی پابندی کو تقویٰ سمجھتے ہیں، چناں چہ جو شخص لباس میں، وضع قطع میں، کھانے پینے میں، احتیاط کی زندگی گزارے اور چند ایک احکامِ شریعت کی پابندی کرے تو اسے متقی سمجھا جاتا ہے۔ بعض لوگ شریعت کی پابندی ہی کو ضروری نہیں قرار دیتے، انھوں نے تقویٰ کا ایک الگ معیار وضع کر رکھا ہے۔ اسی کے مطابق وہ تقویٰ کو ناپتے اور دیکھتے ہیں، اگر ان کے معیار کے مطابق کوئی شخص زندگی گزار رہا ہے تو وہ ان کے نزدیک صاحبِ تقویٰ اور متقی انسان ہے اور اگر ان کے بنائے ہوئے معیار کے مطابق کسی کی زندگی نہیں ہے تو وہ اسے متقی نہیں مانتے۔

تقویٰ درحقیقت دین کی جان ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے آپ روحِ دین بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر تقویٰ ہے اور اس طرح کا تقویٰ ہے جیسا قرآن و حدیث چاہتا ہے تو انسان کے اندر روحِ دین موجود ہے، ورنہ اس کی ساری تگ و دو، چاہے شریعت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، روحِ دین سے خالی ہوگی۔

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی کتاب انسانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت بن کر آئی ہے، جیسا کہ احکامِ صیام کے ذیل میں ارشاد ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرۃ:۱۸۵)	رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ یہ انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی اور حق و باطل میں فرق کرنے والی دلیلیں ہیں۔

مطلب یہ کہ یہ کتابِ ہدایت ہے، جس کے اندر ہدایت کے سلسلے کی دلیلیں بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ یہ کتاب متقیوں کے لیے ہدایت ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ (البقرۃ:۲)	یہ (اللہ کی) کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس میں تقویٰ والوں کے لیے ہدایت ہے۔

ان دونوں ارشادات هُدًى لِّلنَّاسِ اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کو ملانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو شخص اس کتاب سے ہدایت حاصل کرنا اور تقویٰ کی زندگی گزارنا چاہے اس کے لیے وہ ہدایت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اگر آدمی کی فطرت پر پردہ پڑا ہوا ہے، اسے کسی آسمانی ہدایت کا انتظار ہی نہیں ہے اور وہ قرآن کو بھی ایک عام انسانی کتاب کی طرح دیکھتا ہے تو وہ اس سے ہدایت حاصل نہیں کر پائے گا۔ لیکن اگر وہ اس عزم و ارادے کے ساتھ یہ کتاب پڑھے کہ اس سے مجھے فائدہ حاصل کرنا چاہیے تو یقیناً اس کے اندر اس کی پوری زندگی کے لیے ہدایت ہے۔ اسی کو جلالین وغیرہ نے 'السائرین الی التقویٰ' (تقویٰ کی طرف چلنے والے) کہا ہے۔

تقویٰ کے مفہوم میں بچنے اور احتیاط کرنے کا تصور ہے، جیسا کہ امام شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی معصیت سے اجتناب کرے، دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایات دی ہیں ان کی خلاف ورزی سے بچے۔ یہ دونوں

چیزیں جب جمع ہوتی ہیں تو تقویٰ وجود میں آتا ہے۔ اگر آدمی اللہ کی ہدایات کا پابند ہے اور ان کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے تو یہ تقویٰ کا ایک پہلو ہوگا۔ اس کے ساتھ اگر وہ ان چیزوں سے اجتناب نہیں کر رہا ہے، جن سے اللہ نے منع کیا ہے تو گویا تقویٰ اس کی زندگی میں پوری طرح شامل نہیں ہے۔

قرآن مجید میں 'بِر' اور 'تقویٰ' کے الفاظ ہم معنی کے طور پر آئے ہیں۔ چناں چہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

(البقرۃ:۱۷۷)

'بِرّ (نیکی) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو لیکن 'بِرّ' تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (سب) کتب (سماویہ) پر اور پیغمبروں پر۔ اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں (خرچ کرتا ہو) اور نماز کی پابندی کرتا ہو اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرتے ہوں جب عہد کرلیں اور (وہ لوگ) مستقل جمے رہنے والے ہوں تنگ دستی اور بیماری میں اور قتال میں، یہ لوگ ہیں جو (دعوی ایمانی میں) سچے ہیں اور یہی لوگ خدا ترس اور متقی ہیں۔"

اس آیت میں حقیقی 'بـر' کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ آخر میں فرمایا گیا کہ جو لوگ ان خصوصیات کے حامل ہیں وہی متقی ہیں۔ یہ 'بِرّ' اور 'تقویٰ' کے ایک ہونے کی دلیل ہے۔

لفظ 'برّ' میں نیکی کا بڑا وسیع تصور ہے۔ اس میں ادائے حقوق کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یہ حقوق، اللہ کے بھی ہوسکتے ہیں اور بندوں کے بھی۔ انسان نے دونوں میں سے کسی ایک کا حق ادا نہیں کیا تو گویا اس نے حقِ 'برّ' ادا نہیں کیا۔

مذکورہ آیت میں پہلی بات یہ بتائی گئی ہے کہ 'برّ' کی بنیاد ایمان ہے۔ صحیح عقیدہ اور فکر کے بغیر 'برّ' بے بنیاد ہے۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اللہ نے سماج کے جن لوگوں کے جو حقوق خصوصاً مالی حقوق متعین کردیے ہیں ان کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اس ہدایت کے بعد نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر ہے۔ اس سے مفسرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حقوق ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے حقوق سے الگ زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے زکوٰۃ ادا کردی تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اب اس پر سماج کا کوئی حق ہی باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد عہد و پیمان کے پورا کرنے کا حکم ہے۔ وہ عہد چاہے آدمی نے اللہ سے باندھا ہو یا اللہ کے بندوں سے اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ آخر میں ہر حال میں ثابت قدمی کا ذکر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مذکورہ صفات جن افراد میں موجود ہوں وہی اپنے ایمان میں سچے، متقی اور خدا ترس ہیں۔

تقویٰ کی زندگی سے جو کردار ابھرتا ہے اسے قرآن نے مختلف مواقع پر مختلف مناسبتوں سے بیان کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

اور دوڑو مغفرت کی طرف جو تمھارے پروردگار کی طرف سے ہے اور جنت کی طرف جس کی وسعت ایسی ہے جیسے سارے آسمان اور زمین۔ وہ تیار کی گئی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔ وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکو کاروں کو محبوب رکھتا ہے اور وہ لوگ کہ جب کوئی

ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۖ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۖ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○

(آل عمران: ۱۳۴-۱۳۶)

فحش کام کر گزرتے ہیں، یا (گناہ کی وجہ سے) اپنے اوپر زیادتی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو۔ اور وہ لوگ اپنے فعل پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے، ان لوگوں کی جزا بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے اور ایسے باغ ہیں کہ اس کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی، یہ ہمیشہ ہمیشہ ان ہی میں رہیں گے اور یہ اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا۔

ان آیات میں اہلِ تقویٰ کی بعض نمایاں خوبیوں کا ذکر ہوا ہے کہ ان کے اندر انفاق کا بڑا قوی جذبہ ہوتا ہے۔ وہ خوش حالی ہو یا تنگ دستی اپنی استعداد کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، وہ ناگوار باتوں پر مشتعل نہیں ہوتے بلکہ غصہ کو پی جاتے ہیں، ان کی روش انتقام کی نہیں عفو و درگزر کی ہوتی ہے۔ ان سے کسی گناہ کا صدور ہوتا ہے تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس سے توبہ و استغفار کرنے لگتے ہیں۔ کسی غلطی پر اصرار نہیں کرتے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ ہی کے ہاتھ میں مغفرت ہے۔ قرآن مجید نے ان کو آخرت کی کامیابی اور جنت کی خوش خبری دی ہے۔

ایک متقی انسان میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں۔ تقویٰ اس پر بڑے دور رس اثرات ڈالتا ہے اور اس کی زندگی کو مختلف پہلوؤں سے متاثر کرتا ہے۔

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر تقوی کی زندگی گزارے تو اسے اللہ کی طرف سے وہ بصیرت حاصل ہوتی ہے جو صراطِ مستقیم پر چلنے اور دینی زندگی گزارنے کے لیے شرطِ لازم ہے، چناں چہ صاف لفظوں میں کہا گیا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ (الانفال:۲۹)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تم کو فرقان (فیصلہ کی طاقت) دے گا اور تم سے تمھارے گناہ دور کردے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔

یہاں 'فرقان' سے مراد وہ نورِ بصیرت ہے، جس سے آدمی دین کو واضح شکل میں کسی قسم کے التباس کے بغیر دیکھنے لگتا ہے اور کسی شک و شبہ میں گرفتار نہیں ہوتا۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ کے عوض متقیوں کو فتح و نصرت عطا کرے گا اور یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ کون برسرِ حق ہے اور کون باطل کے لیے زور آزمائی کر رہا ہے۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حالات ایسا واضح رخ اختیار کرلیں کہ دینِ حق کے ماننے والے باطل کے خطرات سے محفوظ ہوجائیں۔

سورۂ حدید میں نور کا ذکر کثرت سے آیا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں جب اہلِ ایمان کو اٹھائے گا تو ان کا نور ان کے سامنے ہوگا اور وہ اس کی روشنی میں اپنا راستہ طے کریں گے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

يَوْمَ تَـرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُـمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِـمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْـرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ○ (الحدید:۱۲)

جس دن آپ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا، (کہا جائے گا) آج تم کو بشارت ہے ایسے باغوں کی جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے۔

ظاہر ہے یہ وہ نور ہوگا جو اہلِ ایمان دنیا سے لے جائیں گے، کیوں کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے:

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآئَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ (الحدید:۱۳)

جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے کہیں گے کہ (ذرا) ہمارا انتظار کرلو، ہم بھی تمھارے نور سے کچھ روشنی حاصل کرلیں۔ ان کو جواب دیا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ پھر (وہاں) روشنی تلاش کرو۔

مطلب یہ کہ اہل ایمان کے نور سے منافقین فائدہ اٹھانا چاہیں گے اور اس کی درخواست کریں گے۔ اہلِ ایمان جواب دیں گے کہ نور جہاں مل سکتا تھا تم نے وہاں حاصل نہیں کیا۔ اب یہاں تمھیں نور کیسے ملے گا؟

سورت کے اختتام پر فرمایا گیا:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (الحدید:۲۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اللہ تم کو اپنی رحمت سے دو حصے دے گا اور تم کو ایسا نور عنایت کرے گا کہ تم اس کو لیے ہوئے چلوگے اور وہ تم کو بخش دے گا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

یہی وہ نور ہے جس سے آدمی بے خطر راہِ حیات طے کرتا اور منزل مراد تک پہنچتا ہے۔

قرآن نے مختلف مثالوں سے واضح کیا ہے کہ دنیا و آخرت کی ساری کامیابیاں تقوی کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ اگر آدمی کے اندر تقویٰ ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں بھی سربلند کرے گا اور آخرت میں بھی سرخ رو فرمائے گا۔ حضرت یوسفؑ کو دنیا میں جن مراحل سے گزرنا پڑا اس کی پوری تفصیل سورۂ یوسف میں موجود ہے۔ اسی سورت کے اخیر میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی غلہ لینے کے لیے جب تیسری مرتبہ آپ کے پاس آئے تو حضرت یوسفؑ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم یوسف کو جانتے ہو؟ بھائیوں نے گھبرا کر دریافت کیا: کہیں آپ ہی یوسف تو نہیں ہیں؟ فرمایا:

اَنَا یُوْسُفُ وَ ھٰذَآ اَخِیْ ز قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا ط اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ○ (یوسف:۹۰)

(ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ میرا (حقیقی) بھائی ہے، ہم پر اللہ نے بڑا احسان کیا، واقعی جو شخص تقویٰ کی زندگی گزارتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا۔

اس آیت میں یہ ہدایت موجود ہے کہ مخالف طاقتوں کا غلبہ ہو تو ایک صاحبِ ایمان کو چاہیے کہ وہ صبر سے کام لے اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوگی اور وہ بالآخر کامیاب ہوگا۔

تقویٰ کی زندگی مشکل ہے۔ اس میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آتی ہیں، لیکن آدمی اگر سیدھی راہ اختیار کرے اور اس پر چلنے کا عزم کرلے تو اللہ کی مدد اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ اور تقویٰ کی زندگی گزارنا آسان ہوجاتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ○ (محمد:۱۷)

اور جو لوگ راہ ہدایت پر ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور ان کو ان کے تقویٰ کی توفیق دیتا ہے۔

قرآن نے دنیا و آخرت میں اہلِ ایمان کی کامیابی کا راستہ یہ بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی زندگی گزاریں۔ سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے۔ فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ (آل عمران:۲۰۰)

اے ایمان والو! صبر کرو اور (حریف کے) مقابلے میں جمے رہو اور محاذ پر مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے تم فلاح پاؤگے۔"

تقویٰ کامیابی کی کلید ہے۔ اس کے بغیر کارزارِ حیات میں کسی بھی شخص کے لیے کامیابی ممکن نہیں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تقویٰ کی زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہمیں دنیا و آخرت کی کامیابی سے سرفراز فرمائے۔

๑๑

دعوتِ دین اور اس کے تقاضے

یہ مضمون ایک صاحب نے میری کتاب 'اسلام کی دعوت' کے اقتباسات سے مرتب کیا ہے، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ (جلال الدین)

دنیا میں جتنے پیغمبر آئے سب نے اسلام کی دعوت دی اور اسی مقصد کے لیے خدا کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی بھی بعثت ہوئی، آپ نے دنیا پر یہ حقیقت پوری طرح واضح کردی کہ انسان خدا کا بندہ اور غلام ہے اور اس کی بندگی ہی میں اس کی نجات ہے۔ جو خدا پرست ہوگا وہ کامیاب ہوگا اور جو خدا سے بغاوت کرے گا وہ ناکام ہوگا۔ آپؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب یہ ان لوگوں کی ذمے داری ہے جو اس پیغام کو قبول کرچکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح امت کے سامنے حق کی گواہی دی تھی اسی طرح وہ بھی دوسروں کے سامنے حق کی گواہی دیں:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط (راہِ اعتدال پر قائم امت) بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر حق کے شاہد بنو اور خدا کا رسول تم پر شاہد بنے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت سے فرمایا:

اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ (بخاری و مسلم) تم زمین میں خدا کے گواہ ہو۔

حجۃ الوداع کے موقعے پر آپ ﷺ نے اپنی امت پر تبلیغ دین کی حجت قائم

کرتے ہوئے فرمایا تھا: الا فلیبلغ الشاهد الغائب (جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچادے جو موجود نہیں ہے)۔

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

فو الذی نفسی بیده انها لوصیته الی امته	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ اپنی امت کے لیے آپ کی وصیت تھی۔
(بخاری)	

دعوت کا میدان وسیع ہے

دعوت کے اس کام کو کوئی محدود کام نہ سمجھا جائے، بلکہ یہ بہت وسیع کام ہے۔ اتنا وسیع کہ جب تک آپ میں قوتِ کار موجود ہے اور آپ کی مہلتِ حیات باقی ہے، آپ کام کے نہ ہونے کی شکایت نہیں کرسکتے۔ اس دور میں اسلام کے خادموں کو دعوت کا جو وسیع کام انجام دینا ہے اسے ہم تین بڑے عنوانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱- غیرمسلموں میں دعوت وتبلیغ
۲- مسلمانوں کی اصلاح
۳- اسلام کا غلبہ اور نفاذ

غیرمسلموں میں دعوت وتبلیغ

اسلام کے ماننے والوں کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ غیرمسلموں کے سامنے اس کو اس طرح پیش کریں کہ وہ اس کی صحیح تصویر دیکھ لیں۔ یہ ایک طویل کام ہے۔ دعوت کے اس کام میں آپ کو وقت کے جدید ترین نظریات کا بھی مقابلہ کرنا ہوگا اور قدیم خیالات کا بھی، رسم و رواج کے پرستاروں سے بھی لڑنا ہوگا اور باغیانہ رجحان رکھنے والوں سے بھی، تقلید جامد کا بھی سامنا کرنا ہوگا اور آزاد خیالی اور بے راہ روی کا بھی، آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ فلاح ونجات صرف خدا کے دین میں ہے۔ اس کام کے لیے آپ کو

اسلام کے ساتھ مخالف افکار کو بھی اچھی طرح سمجھنا ہوگا اور پھر وہ تعبیر ڈھونڈنی ہوگی، جس کے ذریعے آپ اسلام کی برتری ثابت کرسکیں۔

مسلمانوں کی اصلاح

غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ اپنی کامیابی کے لیے پہلے مسلمانوں کی اصلاح چاہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام خدا کے دین کی حیثیت سے نازل ہوا ہے اور اسی حیثیت سے قیامت تک باقی رہے گا۔ لیکن بالعموم لوگ اسلام کو اس حیثیت سے دیکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا مذہب ہے۔ غیر مسلموں میں اسی وقت اسلام کا صحیح تعارف ہوگا اور اس کی دعوت برگ و بار لائے گی جب کہ مسلمانوں کے اندر کم از کم ایک ایسا ممتاز گروہ وجود میں آجائے جو اپنے قول و عمل سے اسلام کا ترجمان ہو، جو ہر معاملے میں خدا کا اطاعت گزار ہو، جس کا اخلاق اسلامی ہو، جس کے معاملات خدا کے احکام کے تابع ہوں، جس کی معاشرت و معیشت پر اسلام کی حکومت ہو اور جو اپنے ہر عمل سے یہ ثابت کر رہا ہو کہ وہ خدا کی خوشی کا طالب ہے۔

اسلام کا غلبہ اور نفاذ

اسلام کی دعوت کا تیسرا رُخ یہ ہے کہ اسلام کو غالب کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسلام اگر غالب نہیں ہے تو یقینی بات ہے کہ فکر و عمل کے میدان میں بھی غیر اسلامی قوتوں کی حکومت ہوگی۔ ایسی حالت میں آپ انفرادی طور پر خدا سے اپنا قلبی تعلق تو ضرور قائم کرسکیں گے، خدا کا ذکر کرسکیں گے، اس سے لو لگاسکیں گے، اس کی تسبیح و تہلیل کرسکیں گے، لیکن خارجی زندگی میں اس کے دین پر عمل کرنا اسی حد تک ممکن ہوگا، جس حد تک یہ مخالف قوتیں عمل کی آپ کو اجازت دیں گی۔ جب کہ اسلام پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے۔ اسلام کی دعوت اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک زبردست انقلابی کوشش ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ وہ انسانوں کے تمام خود ساختہ دینوں پر

غالب آجائے اور سب اس کے تابع اور محکوم بن کر رہیں۔اس کا ذریعہ دعوت ہی ہے۔ اسی سے اسلام کو غالب کرنے کا عزم ابھرے گا اور وہ ذہن پیدا ہوگا جو سوائے اسلام کے ہر دستور حیات اور نظام قانون کو رد کردیتا ہے۔

دعوت کی ترتیب

دعوت ایک اصلاحی کوشش ہے، اسلام کی دعوت انسانوں کی فکری و عملی اصلاح کا بہت وسیع کام ہے۔ترتیب کا نہ ہونا ایک عیب ہے، جو کسی بھی کام کو بگاڑ دیتا ہے۔ اسلام کی دعوت کو اس عیب سے پاک ہونا چاہیے۔

بیوی بچوں کی اصلاح

اس ترتیب میں پہلا نمبر بیوی بچوں کی اصلاح کا ہے۔ بیوی اور بچوں کی اصلاح نفل یا مستحب نہیں بلکہ فرض ہے چناں چہ خدا کا حکم ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:٦)	اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

باہر کے انقلاب کے لیے گھر کے اندر انقلاب بہت ضروری ہے۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

الرجل راع علی اهل بیته وهو مسئول عن رعیته (بخاری ومسلم)	مرد نگراں ہے اپنے گھر والوں پر اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

خاندان کی اصلاح

دوسرے نمبر پر خاندان کی اصلاح ہے۔ بیوی اور بچوں کی اصلاح کے بعد اگر ماں باپ بھائی بہن اور قریب ترین رشتہ دار دین سے بے خبر یا اس سے دور ہیں تو ضروری ہے کہ ان کی اصلاح کی فکر کی جائے، اللہ کا حکم ہے:

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ○ (الشعراء:٢١٤)

اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صاف الفاظ میں اپنے باپ کو بت پرستی سے منع کیا اور توحید کو اختیار کرنے کی دعوت دی۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا○ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا○ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا○ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا○ (مریم:٤٢-٤٥)

جب کہ اس نے کہا ابا جان آپ ان چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں۔ اے ابا جان! مرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا لہٰذا آپ میری بات مانیے۔ میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ اے ابا جان! شیطان کی عبادت نہ کیجیے، اس لیے کہ شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ اے ابا جان! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں نہ آجائیں اور شیطان کے ساتھی ہوکر رہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی جب خدا کا یہ حکم نازل ہوا کہ تم اپنے رشتہ داروں کو ڈراؤ تو اپنے خاندان والوں کے درمیان انذار کا فرض انجام دیا تھا اور آنے والے ہولناک دن سے انھیں باخبر کیا تھا۔ یہ خدا کے پیغمبروں کا اسوہ ہے۔ اور داعی کو اسی اسوہ پر عمل کرنا چاہیے۔

بستی اور شہر کی اصلاح

اس کے ساتھ بستی اور شہر کی اصلاح کی کوشش بھی ضروری ہے۔ گھر اور خاندان کی اصلاح کے بعد بستی، شہر اور اس کی اصلاح بھی ایک داعی کا فرض ہے۔ رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا:

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا (الشوریٰ:۷)

اس طرح ہم نے تم پر قرآن عربی وحی کی ہے تاکہ تم مکہ والوں اور ان لوگوں کو جو مکے کے آس پاس رہتے ہیں خدا کے عذاب سے ڈراؤ۔

دعوت اور داعی

اسلام ایک دعوت ہے۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان پر یہ ذمے داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اسے ساری دنیا میں پھیلائیں اور جب تک اس روئے زمین پر اس کا نہ ماننے والا ایک فرد بھی باقی ہے، اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ اتنے بڑے کام کے لیے داعی کو ان اصول و آداب کا لحاظ کرنا چاہیے جو اسے بتائے گئے ہیں، نیز وہ اپنے اندر وہ اعلیٰ ترین اوصاف بھی پیدا کرے، جن کو اسلام اس کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ دعوت کی کامیابی اور ناکامی کا بہت کچھ انحصار داعی پر ہے۔ ذیل کی سطروں میں بہت ہی اختصار کے ساتھ ان اصول وضوابط اور اقدار و اوصاف کا ذکر کیا جارہا ہے۔

۱- جو لوگ اسلام کی دعوت لے کر اٹھیں ان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اس کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کریں کہ وہ کسی خاص گروہ کی متاع نہ معلوم ہو، بلکہ پوری نوعِ انسانی اس کو اپنا سرمایہ سمجھے۔ اس کا ثبوت ان کو اپنی زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی دینا ہوگا۔

۲- اسلام کی دعوت پوری زندگی کی اصلاح کی دعوت ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں وہ راہ اختیار کرے، جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ داعی کی تمام تر کوششیں اسی غرض و غایت کے لیے ہوں۔ اس کو چاہیے کہ پوری قوت کے ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں احکامِ الٰہی کی اتباع کی دعوت دے۔

۳- دعوت دین کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان نظریات کو مستحکم کیا جائے جن پر دین کی اساس قائم ہے اور پھر فروعِ دین میں سے جس فرع کو خود دین نے جتنی اہمیت دی ہے اسے اتنی ہی اہمیت دی جائے۔ اسلام کی ایک تو روح ہے اور ایک اس کا

ظاہری ڈھانچہ۔ اسلام کی دعوت کا کام صحیح طریقے سے اسی وقت انجام پاسکتا ہے جب کہ داعی اس کے ظاہری ڈھانچے پر زور دینے سے زیادہ مخاطب میں اس کی روح پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

۴- اسلامی دعوت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں سب سے پہلے خود داعی کا ذہن صاف ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اسلام کیا ہے اور اس کی دعوت کیا ہے؟ اس کا مقصد اور منزل ہر وقت اس کے سامنے رہے۔ اس کے تقاضوں سے وہ بہ خوبی واقف ہو اور اچھی طرح جانتا ہو کہ اس کے لیے صحیح طریقہ کار کیا ہے اور کون سا طریقہ اس کے لیے مناسب ہے؟

۵- اسلام کا ایک خاص مزاج ہے۔ اس مزاج سے بہت سی چیزیں مناسبت رکھتی ہیں اور بہت سی مناسبت نہیں رکھتیں۔ داعی کو وہی چیزیں اختیار کرنی چاہییں جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں اور جو چیزیں اس سے میل نہ کھاتی ہوں اسے ان سے احتراز کرنا چاہیے۔

٦- داعی کو چاہیے کہ اپنی بات پورے جوش اور قوت کے ساتھ پیش کرے اور ایسا اسلوب اختیار کرے، جس سے انسان کا خوابیدہ ضمیر جاگے اور اس کے جذبات میں حرکت پیدا ہو۔ اس کا اسلوب صاف اور واضح ہو۔

ے- داعی کو چاہیے کہ دعوت کو پیش کرنے میں لوگوں کی ذہنی آمادگی کا خیال رکھے۔ ان کے سامنے اس وقت دعوت پیش کرے، جب کہ وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ اس کو سن سکتے ہوں اور غور وفکر کے لیے آمادہ ہوں۔

۸- داعی کو ایسے بے شمار لوگوں کے درمیان دین کا کام کرنا ہے، جو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود اسے سوائے کسی ناگزیر دینی ضرورت کے انھیں کافر اور فاسق جیسے الفاظ کہنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

۹- داعی کے اندر اپنے ہدایت یاب اور مصلح ہونے کا غرور نہیں ہونا چاہیے، یہ

چیز اس کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہ دے گی۔ داعی کے اندازِ تخاطب میں تحکم نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ ان لوگوں کا انداز ہے جو دوسروں کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں۔

۱۰- داعی کو مخاطب کے ساتھ ایسا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہو، یا اس کی مخالفت شروع کردے، بلکہ داعی کا اخلاق اتنا اونچا ہو کہ لوگ اس کی طرف کھنچیں اور اس کی بات سننے کے لیے تیار ہوں۔

۱۱- داعی کو جلد باز نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جلد باز انسان دعوت کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

داعی کے اوصاف

کار دعوت کے لیے داعی کے اندر بعض اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱- ایمان باللہ

داعی کا اللہ پر مضبوط ایمان ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کی غلامی کے لیے وقف کردے۔ اللہ تعالیٰ بندوں سے جزوی غلامی کا نہیں بلکہ کلی غلامی کا تقاضا کرتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ○	اے ایمان والو تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ جاؤ، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

(البقرۃ:۲۰۸)

۲- ایمان بالآخرۃ

داعی کو آخرت پر یقین کامل ہو۔ اسلام کی دعوت آخرت سے غافل انسانوں کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیں اور جو اس تصور سے کانپتے ہوں کہ وہ خدا کے سامنے حاضر ہوں گے اور ان سے پوچھا

جائے گا کہ انھوں نے اس کے دین کی کوئی خدمت کی یا نہیں؟ دعوت کو ختم کرنے کے لیے یہاں قید خانوں کے دروازے ہی نہیں کھلتے بلکہ تخت و تاج بھی پیش کیے جاتے ہیں، یہ امتحان بڑا سخت ہوتا ہے، جو لوگ لوہے کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیتے ہیں وہ سونے کی زنجیروں میں بہ خوشی قید ہوجاتے ہیں۔ اس امتحان میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو آخرت کی نعمتوں کو پانے کی خوشی میں یہاں کی راحتوں کو بھول جائے۔ جو آخرت کی ناکامی کو ناکامی اور آخرت کی کامیابی کو کامیابی سمجھتا ہو، جس کا ایمان ہو:

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (آل عمران:۱۸۵)

جو شخص دوزخ کی آگ سے دور ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا وہی کامیاب ہوا۔

۳-قرآن مجید سے تعلق

قرآن مجید دنیا میں مومن کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔قرآن سے داعی کا تعلق تین طرح کا ہوتا ہے۔ ا۔اس کی تلاوت۔ ۲۔اس پر عمل اور ۳۔اس کی طرف دعوت۔ قرآن اللہ کی حکومت کا منشور ہے۔ وہ جس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اللہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۷)

(اے محمد) جس وقت تم (دشمن پر) تیر چلا رہے تھے تو تم نہیں چلا رہے تھے بلکہ اللہ چلا رہا تھا۔

۴-نماز

اللہ کو یاد رکھنے والا ہی لوگوں کے دلوں میں اللہ کی یاد پیدا کرسکتا ہے اور نماز اللہ کی یاد کا بہترین ذریعہ ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِىْ (طٰہٰ:۱۴)

نماز قائم کرو میری یاد کے لیے۔

دعوتِ دین کے لیے قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اونچی سیرت اور مضبوط کردار کا تقاضا کرتے ہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود بھی معروف پر عمل کرے اور منکر سے بچے۔ نماز انسان میں اس کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَاءِ وَالۡمُنۡکَرِ (العنکبوت:۴۵)	نماز قائم کرو یقیناً نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے۔

۵- انفاق

انفاق فی سبیل اللہ دین کی ایک اہم بنیاد ہے۔ یہ اس دعوت کے لیے بھی ضروری ہے، جس کے آپ داعی ہیں اور جسے آپ کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ دعوتِ دین انسانوں کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش ہے۔ جو شخص یہ کوشش کرتا ہے وہ نوعِ انسانی کا بڑا خیر خواہ ہے اور انفاق خیر خواہی کا مظہر ہے۔

۶- قربانی

اسلام کی دعوت نوعِ انسانی کے ساتھ سب سے بڑی بھلائی کرنے کا نام ہے اور یہ کارِ عظیم اس وقت انجام پائے گا جب کہ اس کے پیچھے آپ اپنے آپ کو گھلا دیں، اس کے لیے اپنی آسائش و راحت کو، اپنے وقت اور فرصت کو، اپنے مال اور دولت کو، غرض ہر اس چیز کو قربان کر دیں جو آپ کی ملکیت میں ہے۔ اس کے بغیر اس کام کا حق نہ پہلے ادا ہوا ہے اور نہ اب ادا ہو سکے گا۔

۷- استقامت

'ایمان' اور 'استقامت' یہ دو لفظ اسلام کا حاصل ہیں۔ ہماری جدوجہد کا مقصد اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ قرآن نے صراحت کی ہے کہ یہ چیز صرف ایمان اور استقامت ہی سے مل سکتی ہے۔ آنے والے ہولناک دن کے خوف سے وہی شخص

محفوظ ہوگا اور اسی کو اللہ کے فرشتے جنت کی خوش خبری دیں گے، جس کو اس دنیا میں ایمان و استقامت کی زندگی نصیب ہوگی۔ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ۝

(حٰمٓ السجدة: ۳۰-۳۲)

جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے تو ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو، تمھارے لیے خوش خبری ہے جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم تمھارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی تمھارے دوست ہوں گے اور تمھارے لیے جنت میں وہ سب کچھ ہے جو تمھارا جی چاہے اور جو کچھ تم مانگو وہ تم کو یہاں ملے گا۔ یہ مہمانی ہے غفور رحیم اللہ کی طرف سے۔

دعوتِ دین استقامت کی طالب ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر پوری طرح قابو حاصل ہو۔ اس کے عزم میں اتنی پختگی ہو کہ نفس کی خواہشات اپنی طرف کھینچ رہی ہوں تو وہ ان کو ٹھکرا کر حق سے چمٹا رہے، اسے اپنے ایمان سے اتنی محبت ہو کہ دنیا اسے کسی قیمت پر خرید نہ سکے۔ اس کے بغیر زبان پر تو بار بار دین کا نام آتا رہے گا، لیکن اس راہ کو عملاً اختیار کرنا اور پامردی اور استقلال کے ساتھ اس پر چلنا آسان نہ ہوگا۔

(ماہ نامہ افکار ملی، ہندستان میں اسلام کی دعوت۔ خصوصی اشاعت۔ اگست ۲۰۰۷ء)

خطبۂ عید الفطر[1]

(جائزے اور احتساب کی ضرورت)

آج عید کا دن ہے۔ ہمارے اور آپ کے اور ساری دنیا کے آقا و رہ نما حضرت محمد ﷺ کا حکم ہے کہ اس دن خوشی منائی جائے۔ یہ خوشی منانا بھی ایک عبادت ہے۔ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے پابند ہیں۔ ان ہی کے حکم پر ہم نے روزے رکھے اور جب حکم ہوا تو روزے ختم کردیے۔ کل تک روزہ ترک کرنا معصیت تھا اور آج روزہ رکھنا گناہ ہے۔ آج خوشی اس بات کی ہے کہ ہم نے رمضان کے روزے رکھے، عام دنوں سے زیادہ نمازیں پڑھیں، کچھ نہ کچھ صدقہ و خیرات بھی کیا۔ اس سب کے باوجود سوال یہ ہے کہ کیا اس سے رمضان کے مطالبات پورے ہوگئے اور اس کا حق ادا ہو گیا؟ روزے کا مقصد تقویٰ اور خدا ترسی پیدا کرنا ہے۔ رمضان اسی کی تربیت کے لیے آتا ہے۔ کیا ہمارے، اندر تقویٰ کی کیفیت پیدا ہوئی اور خداترسی کے جذبات ابھرے؟ عبادت میں انابت مطلوب ہے۔ کیا یہ مطلوب حاصل ہوا؟ یہ ہم دردی اور غم گساری کا مہینہ ہے۔ کیا ہم نے غریبوں اور ناداروں کو چند پیسوں کی خیرات ہی دی یا ان کے دکھ درد کو

---

[1] مسجد اشاعتِ اسلام، دعوت نگر نئی دہلی میں عید الفطر (۱۴۲۶ھ/ ۴؍نومبر ۲۰۰۵ء) کی مناسبت سے جو خطبہ دیا گیا، اسے کیسٹ کی مدد سے مرتب کرکے پیش کیا جارہا ہے۔

صحیح معنوں میں محسوس کیا، ان کے حقوق پہچانے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی سنجیدہ کوشش بھی کی؟ یہ قرآن مجید کی تلاوت اور اس پر غور و فکر کا مہینہ ہے۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اندر قرآن کو پڑھنے اور اسے سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا اور وہ پرورش پا رہا ہے؟ رمضان میں شیطان پابند سلاسل ہوتے ہیں۔ کیا ہمارا گھر، ہمارا محلّہ اور ہماری بستی اس کے اثرات سے محفوظ رہے؟ اس ماہ مبارک کے ختم ہونے پر ہماری دینی اور اخلاقی حالت پہلے سے بہتر ہوئی یا ہم جہاں تھے وہیں رہے۔ اس کا جواب یہی ہوگا کہ ہماری حالت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی، بلکہ ہم نے کچھ اور قدم پستی ہی کی طرف بڑھائے۔

اگر آپ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں، اپنے محلّہ اور بستی کو اور اپنے گھر کو دیکھیں تو بھی صورتِ حال اس سے مختلف نہ پائیں گے۔ اب آپ عالمی سطح پر اس امت کی حالت پر غور کیجیے، جس سے ہم سب کا تعلق ہے اور جس سے ہمارا دین و ایمان کا رشتہ ہے۔ پوری دنیا میں یہ امت ہدفِ تنقید بنی ہوئی ہے۔ ہر غلط کام میں اس کا نام لیا جاتا ہے۔ اتہامات اور الزامات کی بارش ہے کہ مسلسل برس رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس امت میں دہشت گرد اور درندہ صفت افراد پیدا ہو رہے ہیں، خونِ ناحق کا ارتکاب کر رہے ہیں اور امت ان کی پرورش کر رہی ہے۔ اس اُمت کو فنڈامینٹلسٹ اور بنیاد پرست کا طعنہ دیا جاتا ہے، اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ وہ ماضی کی یادوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ ہمارا ذکر ایک ایسی قوم کی حیثیت سے ہوتا ہے، جو جاہل اور ناخواندہ ہے اور جو غیر مہذب اور ناشائستہ ہے۔ اسے ہر فتنہ اور فساد کا سرچشمہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔ امت کے کسی فرد سے کسی بڑی غلطی کا صدور ہوجائے تو پوری ملت کو مجرم گردانا جاتا ہے، جب کہ بڑے بڑے مجرم دنیا کی ہر قوم میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کے جرائم

کو ان کا ذاتی عمل قرار دیا جاتا ہے اور پوری قوم کو مطعون نہیں کیا جاتا۔ یہ امت کروڑوں کی تعداد میں بلکہ اب تو ایک ارب پچاس کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔ دنیا کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی چار درجن سے زیادہ حکومتیں ہیں، وہ اتنی کم زور اور بے بس ہے کہ اس کے ملک کے ملک تباہ ہو رہے ہیں، اس کی آزادی و خود مختاری ختم کرنے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں، اس کے ذرائع اور وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے بہانے تلاش کیے جا رہے ہیں لیکن یہ امت اس کا جواب کیا دیتی، اپنا دفاع کرنے کی ہمت اور حوصلہ بھی کھوچکی ہے۔ سوچیے! وہ کہاں سے اٹھی تھی اور کہاں پہنچ گئی؟

اس اُمت کا تقویٰ، اس کی خدا ترسی، اس کی عبادت و ریاضت مشہور تھی، لیکن آج یہ خوبیاں کہیں کہیں افراد میں تو نظر آتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اُمت کا دامن ان سے خالی ہے۔ اس کی اصول پسندی 'اس کی دیانت و امانت' اس کا پاس عہد، اس کی راست گوئی اور اس کے اخلاق و کردار کا ہر طرف چرچا تھا، اب خیانت، بد عہدی اور غیر اخلاقی اعمال کے لیے اس کے افراد کو مثال میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی پہچان یہ تھی کہ وہ غریبوں، ناداروں، مظلوموں اور بے کسوں کی پشت پناہ، ان کا دفاع کرنے والی اور ان کے حقوق کی پاسبان اور محافظ ہے، لیکن آج یہ سارے کام دوسری قومیں اور تنظیمیں کر رہی ہیں۔ فلاح و بہبود کے ان کاموں میں اس کا کوئی خاص کردار نہیں نظر آتا۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ عدل و انصاف کی علم بردار ہے، اس کے لیے اس کا ہر فرد اپنا اور اپنے عزیزوں کا نقصان برداشت کر سکتا ہے، اس کا انصاف بے لاگ ہوتا ہے، اس معاملے میں وہ دوست اور دشمن کا فرق نہیں کرتی، لیکن آج اس امت کو اس حیثیت سے دنیا جانتی تک نہیں۔

بزرگو اور بھائیو! اسی امت سے ہم سب کا تعلق ہے۔ ایک وقت تھا کہ قوموں کی قسمت کا فیصلہ آپ کرتے تھے، آج آپ کی قسمت کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کو امن و امان آپ نے دیا، آج آپ دوسروں سے اپنی امان کے طالب ہیں۔ آپ نے دنیا کو عدل و انصاف سے روشناس کرایا اور اس کے تقاضے پورے کیے، آج آپ انصاف کی بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ آپ نے دنیا کو علم کی روشنی عطا کی، آج آپ دوسروں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ نے دنیا کو تہذیب و شائستگی سے نوازا، آج آپ دوسروں کی تہذیب کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیسا انقلابِ حال ہے؟

اس انقلابِ حال کے بہت سے اسباب بیان کیے جاسکتے ہیں اور بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک ہی حقیقی سبب ہے، اس کے علاوہ دوسرا سبب تلاش کرنا بے سود ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے اسلام کا دامن چھوڑ دیا۔ وہی اسلام جس نے آپ کو فوز و فلاح سے ہم کنار کیا تھا، آپ نے اس نسخے کا استعمال ترک کر دیا جس نے آپ کو بام عروج پر پہنچایا تھا۔ سوچیے! اپنی تاریخ پر غور کیجیے! آپ کیا تھے، آپ صحرانشیں تھے، شترباں تھے، قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، ہر وقت برسرِ پیکار رہتے تھے، تہذیب و تمدن سے نا آشنا اور بدوی زندگی گزار رہے تھے، دنیا کی قوموں میں آپ کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ اسلام نے آپ کی قسمت بدل دی، آپ کو وہ سب کچھ دیا، جس کا تصور نہیں کرسکتے تھے۔ آج بھی آپ اسی ذریعے دوبارہ ترقی سے ہم کنار ہوسکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پھر آپ اسی راستے پر چل پڑیں جس راستے کو آپ نے چھوڑ دیا ہے۔

سب سے پہلے اپنے ایمان کو مضبوط کیجیے۔ اس یقین کو تازہ کیجیے کہ

دینِ اسلام ہی میں آپ کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ دنیا کو اس کا ثبوت فراہم کیجیے کہ اللہ کا دین ناقابل عمل نہیں ہے، بلکہ آج بھی اس پر عمل ہوسکتا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ آپ میں وہ لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو اسلام کو ماضی کی روایت سمجھتے ہیں، جن کا اسلام سے تعلق صرف اس حد تک ہے کہ وہ مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے، ان کا نام مسلمانوں کے رجسٹر میں درج ہے اور ان کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ آپ میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی اسلام سے وابستگی برائے نام ہے۔ عملی زندگی میں مشکل ہی سے اس کا اظہار ہوتا ہے، اس اُمت کی بہت بڑی اکثریت وہ ہے جو اسلام پر عمل کرنا چاہتی ہے لیکن اس نے اسلام کو مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ وہ زندگی کے صرف ایک حصہ پر اس کی حکم رانی کی عملاً قائل ہے، دوسرے حصوں کو وہ اس سے آزاد رکھنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی عبادات یا کسی درجہ میں اس کے خانگی امور اسلام کے تابع رہیں، اس سے آگے اپنی معاشرت، اپنے معاملات اور قانون و سیاست کو اس سے آزاد دیکھنا چاہتی ہے۔ ان کا اخلاق اور ان کی سیرت اور کردار اسلام کا نمونہ پیش نہیں کرتے، حالاں کہ اسلام کا صاف مطالبہ ہے:

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً — اسلام میں پوری طرح آجاؤ۔

(البقرۃ:۲۰۸)

ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی طور پر ہی نہیں، اجتماعی طور پر بھی اسلام میں آجاؤ، فرداً فرداً ہی نہیں، سب مل کر اسلام میں آجاؤ۔ جب افراد بھی اور ملت بھی پوری طرح اسلام میں آجائیں گے تو اسلام کی برکتیں اور اس کے ثمرات ظاہر ہونے لگیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کو لے کر کھڑے ہوجایئے۔ اپنی عملی

زندگی سے اسلام کا ثبوت فراہم کیجیے اور دنیا کو اس کی دعوت دیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عدل و انصاف کا علم بردار بنایا ہے، حکم ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ... (المائدۃ:۸)

اے ایمان والو! اللہ (کی رضا) کے لیے کھڑے ہوجاؤ، عدل و انصاف کے گواہ بن کر۔

اٹھیے! دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے۔ اسی میں اللہ کی رضا اور خوش نودی ہے۔ یہ دین کے تعارف اور اس کی نصرت اور حمایت کا بہترین طریقہ ہے۔ اس میں دنیا اور آخرت کی فوز و فلاح ہے۔ دنیا باطل نظریات کا بڑا تجربہ کر چکی اور بہت تھک چکی ہے۔ وہ دینِ حق کی تلاش میں ہے۔ اسے بتایئے کہ اسلام کے سائے میں اسے عدل و انصاف ملے گا، سکون اور راحت نصیب ہوگی، دنیا کے مسائل حل ہوں گے، اس کا پروردگار اس سے خوش ہوگا اور آخرت میں ابدی نعمتوں سے سرفراز کرے گا۔ اللہ تعالیٰ میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

(ماہ نامہ راہِ اعتدال عمر آباد، دسمبر ۲۰۰۵ء)

ترجیحاتِ دین

ترجیحاتِ دین کا سوال بہت اہم ہے۔ دین کی بعض اساسات ہیں اور بعض کی حیثیت فروع کی ہے۔ جو اہمیت اصول کی ہے وہ فروع کی نہیں ہے، اس لیے کہ فروع اصول کی تابع ہیں اور ان ہی سے نکلتی ہیں۔ ان اساسات ہی کے ذریعے دین کی ترجیحات متعین ہوتی ہیں۔ یہ ترجیحات بدل جائیں تو اس کا امکان ہے کہ اصولِ دین کی طرف تو توجہ کم ہو یا بالکل نہ ہو اور فروعِ دین کی جو حیثیت ہے اس سے زیادہ ان کو اہمیت دی جانے لگے۔ اس سے دین کا پورا نظام اور اس کا مزاج لازماً متاثر ہوکر رہے گا۔

دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کے سلسلے میں بھی اصول و فروع کی رعایت نہایت ضروری ہے۔ ورنہ ہوسکتا ہے کہ جو قدم پہلے اٹھنا چاہیے وہ بعد میں اٹھے اور جو قدم بعد میں اٹھنا چاہیے وہ پہلا قدم ہوجائے۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ ہماری ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ دین میں جس بات کو اصل اور اساس کی حیثیت حاصل ہے اس کو مضبوط کرنے سے پہلے فروعِ دین پر سارا زور صرف ہونے لگتا ہے اور ساری بحثیں ان ہی کے گرد گردش کرنے لگتی ہیں۔ یہ ایک غیر فطری طریقہ ہے۔ اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

یہاں قرآن مجید کی روشنی میں ترجیحاتِ دین کو واضح کرنے کی کوشش

کی جائے گی۔

۱- مکہ میں قرآن مجید کا تقریباً دو تہائی حصہ نازل ہوا۔ اس میں اصل زور اسلام کے عقائد پر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت، رسالت اور اس کی ضرورت، آخرت اور اس کی تفصیلات زیر بحث آئی ہیں۔ ان کے حق میں دلائل دیے گئے ہیں، ان پر جو اعتراضات ہو رہے تھے، ان کی تردید کی گئی ہے اور جو شکوک وشبہات پھیلائے جا رہے تھے انھیں رفع کیا گیا ہے۔ یہی عقائد اسلام کی اساس ہیں۔ جب یہ مستحکم ہوگئی تو شریعت کی تفصیلات فراہم کی گئیں جو دراصل ان ہی عقائد کے لازمی تقاضوں کے طور پر سامنے آرہی تھیں۔

۲- قرآن مجید نے بتایا کہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ اس پر اسی کا حکم چل رہا ہے۔ وہ ہر آن اس کی تسبیح وتحمید میں لگی ہوئی ہے اور اس کے احکام بجا لا رہی ہے۔ اس کے اقتدار میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی انسان کا خالق و مالک ہے۔ وہ اس کا بندہ اور مخلوق ہے، اس کے لیے زندگی کا صحیح ترین راستہ یہ ہے کہ وہ اللہِ واحد کی عبادت اختیار کرے اور اس کے احکام بجا لائے۔ وہ اگر اس سے انکار کرتا ہے یا عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے تو انتہائی غلط راہ پر چلتا ہے اور تباہی کو دعوت دیتا ہے۔ اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰـهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ (الاعراف:۵۹)

اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے علاوہ تمھارا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ (اس سے انحراف کے نتیجے میں) کہیں تم بڑے دن کے عذاب میں نہ پکڑے جاؤ۔

یہی ہر پیغمبر کی تعلیم کا بنیادی نقطہ رہا ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف:۶۵۔۷۴۔۸۵)۔

عبادت دراصل اس بات کا اظہار و اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان اپنا معبودِ برحق تسلیم کرتا ہے اور اس کے سامنے پوری طرح سرنگوں ہو رہا ہے۔ اس کے ہر حکم کو تسلیم کرتا اور اس کی نافرمانی کو اپنے لیے جائز نہیں تصور کرتا ہے۔ یہ اللہ کے نازل کردہ پورے نظامِ شریعت کو قبول کرنے کا اعلان ہے۔ اگر صحیح معنی میں جذبۂ عبادت پیدا ہو جائے تو احکامِ شریعت کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے دورِ اوّل میں جذبۂ عبادت کو اس قدر ابھارا اور مضبوط کیا کہ نظامِ شریعت پر عمل مشکل نہیں رہا۔ دل و جان سے اس کی پابندی ہوتی رہی۔

۳- قرآن مجید میں اللہ کے رسولوں کا اور ان کی دینی جد و جہد کا ذکر کہیں اختصار سے اور کہیں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس سے وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنے زمانے میں ان ہی اساسات پر اصلاً زور دیا اور ان ہی کی روشنی میں فکری و عملی اصلاح کی کوشش کی۔ اللہ کے پیغمبر جن قوموں میں آئے ان میں بہت سی سماجی اور اخلاقی خرابیاں موجود تھیں۔ ظلم اور ناانصافی تھی، جان و مال محفوظ نہ تھے اور حقوق پامال ہو رہے تھے۔ اللہ کے پیغمبروں نے بتایا کہ یہ ساری خرابیاں اس لیے ہیں کہ ان فکری اساسات کو تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے جنھیں وہ پیش کر رہے ہیں۔ اگر فرد اور معاشرہ خدا کو اس طرح مانے جس طرح ماننا چاہیے، اس کی ہدایت کو قبول کرے اور آخرت کی باز پرس کا یقین ابھر آئے تو پوری زندگی کا رُخ صحیح ہو سکتا ہے اور انسان پر دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہیں کھل سکتی

ہیں۔ یہی طریقہ ہے جس سے کسی بھی فساد زدہ معاشرہ کی اصلاح کا امکان ہے۔ جب تک اسلام کی اساسات پر ایمان نہ ہو اور وہ دل و دماغ میں پیوست نہ ہو جائیں، سماج میں کسی صالح انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۴- قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کے ساتھ انسانوں کے حقوق کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان میں سے بعض حقوق کو قانونی درجہ حاصل ہے۔ یہ حقوق اگر ادا نہ ہوں تو انسان کی گرفت ہوگی۔ لیکن بعض حقوق کی حیثیت اخلاقی ہے۔ ان سے ہم دردی اور محبت کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں۔ اس سے قطع نظر قرآن کے نزدیک، خدا رسول اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان دور و نزدیک کے حق داروں کے حقوق ادا کرے اور اس کے اندر نوعِ انسانی کی خدمت کا جذبہ پایا جائے۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کے کام آئے اور ان کی ہر ممکن مدد کرے۔ یہ بات ایمان کے منافی ہے کہ ایک شخص کو تمام حقوق حاصل ہوں، وہ عیش کی زندگی گزارے اور اس کے آس پاس کے لوگ اپنی بنیادی ضروریات تک پوری نہ کر پا رہے ہوں۔ وہ مدد کے محتاج ہوں اور ان کی مدد نہ کی جائے۔ جس انسان کے اندر ہم دردی و غم خواری کے جذبات نہ ہوں اور جو ناداروں اور محتاجوں کے کام نہ آئے اور ان کے حقوق نہ پہچانے اسے خدا پرست مشکل ہی سے کہا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید کی مکی سورتوں میں ایک مختصر سورت 'البلد' ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتوں کا ذکر ہے کہ اس نے اسے آنکھیں عطا کیں، زبان دی، ہونٹ دیے، بھلائی اور برائی کے راستے بتا دیے۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ○ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا	پس وہ گھاٹی میں داخل نہیں ہوا۔ تمھیں کیا
الْعَقَبَةُ○ فَکُّ رَقَبَةٍ○ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ	معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ ہے گردن کو چھڑانا

یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ o یَتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ o اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ o ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَۃِ o اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ o وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا ہُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡئَمَۃِ o عَلَیۡہِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَۃٌ o (البلد: ۱۱-۲۰)	(غلام کو آزاد کرنا) یا بھوک کے دنوں میں کھانا کھلانا قرابت دار یتیم کو یا مسکین کو جو (فاقہ کی وجہ سے) خاکِ زمین پر پڑا ہوا ہے۔ پھر ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنھوں نے صبر کی اور رحم کی ایک دوسرے کو تاکید کی۔ یہی لوگ دائیں جانب والے ہیں (جن کے دائیں ہاتھ میں ان کا نامۂ اعمال ہوگا) اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ بائیں جانب والے ہیں (جن کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں ہوگا) ان پر آگ ہر طرف سے ہوگی۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بہ کثرت موجود ہیں۔ جن سے انسانی حقوق کی اہمیت واضح ہوتی ہے[1]

قرآن مجید نے حقوق العباد کو جو مقام دیا ہے، ہماری ترجیحات میں اسے وہ مقام حاصل ہونا چاہیے۔ ورنہ دین کا ناقص تصور ابھرے گا اور سماج کے لیے اس کی ضرورت اور اہمیت واضح نہ ہوسکے گی۔

۵- قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات میں اخلاق کی تعلیم بہت نمایاں ہے۔ اس نے آغاز ہی سے اعلیٰ اخلاق کی ترغیب دی۔ رذیل اخلاقیات کی شدید مذمت کی اور ان سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔ اخلاق کا جذبہ اور پاکیزہ اخلاق کا رجحان انسان کی فطرت میں ہے، لیکن اس پر بعض اوقات پردے پڑ جاتے ہیں۔ جب تک یہ پردے نہ ہٹائے جائیں بے غرض اخلاق

---

[1] اس کی کسی قدر تفصیل راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کا ظہور نہیں ہوتا۔ قرآن کے نزدیک خدا اور آخرت پر یقین ہی سے صداقت و راست بازی، دیانت و امانت، احترام آدمیت، عفت و عصمت، محبت و رافت، تواضع اور خاک ساری اورعفو و درگزر جیسی اعلیٰ اخلاقیات ابھرتی ہیں۔ اگر آدمی کو خدا کی ذات پر یقین نہ ہو، اس کی ہدایت سے وہ محروم ہو اور آخرت کی باز پرس کا اسے اندیشہ نہ ہو تو کسی نہ کسی رُخ سے اور کسی نہ کسی عنوان سے وہ اخلاقی پستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے اندر کچھ اخلاقی خوبیاں پائی بھی جائیں تو ان سے زیادہ اخلاقی خرابیاں اسے دامن گیر رہتی ہیں، جن سے وہ محفوظ نہیں رہتا۔ افسوس کہ اخلاق کی عظمت اور اہمیت امت کی نگاہوں سے اوجھل ہوکر رہ گئی ہے۔ اس کا کوئی اخلاقی امتیاز نہیں رہ گیا ہے، بلکہ دوسری قومیں اپنے اخلاق و کردار میں بعض پہلوؤں سے ممتاز ہیں۔ امت کو اخلاقی لحاظ سے اوپر اٹھانے کی سنجیدہ کوشش بھی نہیں ہو رہی ہے۔ اسلام فرد کی جس طرح تربیت کرتا اور جو پاکیزہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کی اساس میں اخلاق شامل ہے۔ اس کے بغیر اسلامی سیرت اور اسلامی معاشرہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اخلاق کو اسی حیثیت سے اختیار کرنے اور دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

٦- اللہ کے رسولوں کی اولین ذمے داری دعوت و تبلیغ اور اہلِ ایمان کی اصلاح و تربیت رہی ہے۔ دعوت کے ذریعے وہ دین کا ہمہ گیر اور انقلابی تصورِ حیات پیش کرتے ہیں اور جو لوگ اسے قبول کرتے ہیں ان کے فکر و عمل کی اس تصورِ حیات کے تحت تربیت کرتے ہیں۔

امتِ مسلمہ کو بھی یہ دونوں ہی کام انجام دینے ہیں۔ جہاں تک اہلِ ایمان یا امتِ مسلمہ کی اصلاح کا تعلق ہے اس کی طرف علماء، صلحاء اور

مصلحین امت کی توجہ رہی ہے۔ انھوں نے تذکیر و تفہیم، وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کے ذریعے اسے بگاڑ سے بچانے اور راہ راست پر قائم رکھنے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں۔ مدارس و مکاتب اور جامعات کے قیام کے ذریعے بھی یہ مقصد حاصل ہوتا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ امت کی علمی، معاشی اور سیاسی فلاح کے لیے بھی مسلسل کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلے کے بعض اقدامات سے اختلافات کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کوششیں بہ ہرحال امت کی مادی اور دنیوی ترقی ہی کے لیے رہی ہیں۔

دعوت و تبلیغ کا میدان بھی بالکل خالی نہیں رہا۔ اس میں کوششیں ہوتی رہی ہیں اور بعض بہت قابل قدر بھی ہیں، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کارِدعوت ہماری ترجیحات میں شامل نہیں رہا ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت اور نزاکت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید نے اُمت کے مقصدِ وجود کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط	تم خیر اُمت ہو جسے لوگوں کی ہدایت و رہ نمائی کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

(آل عمران:۱۱۰)

آیت میں 'اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ 'اَلنَّاسُ' کے اندر ہر دور اور ہر خطۂ ارض کے تمام انسان آتے ہیں۔ اس پر 'لِ' حرف جار آیا ہے۔ اس میں جیسا کہ اہل علم نے بیان کیا ہے، نفع پہنچانے کا تصور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کا وجود اس لیے ہے کہ دنیا بھر کے

انسانوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اس فائدہ کی شکل بھی آیت میں بتا دی گئی ہے کہ وہ تمام عالم میں 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا فرض انجام دے۔ معروف و منکر کے الفاظ وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ سب سے بڑا معروف توحید اور سب سے بڑا منکر شرک ہے۔ اسلام نے جن نیکیوں کی تعلیم دی ہے وہ سب معروفات ہیں اور جن برائیوں سے منع کیا ہے وہ سب منکرات میں آتے ہیں۔ اس طرح دین کے پورے نظامِ فکر و عمل کی دعوت دینا امر بالمعروف ہے اور مخالفِ دین افکار و نظریات اور ان پر مبنی طرز ہائے حیات کی کم زوریاں اور خامیاں واضح کرنا اور ان سے بچانے کی کوشش کرنا نہی عن المنکر ہے۔[1]

قرآن مجید میں اس امت کو 'اُمتِ وسط' بھی کہا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ	اسی طرح ہم نے تم کو 'امت وسط' بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو، اور رسول تم پر گواہ ہو۔

(البقرۃ:۱۴۳)

'امتِ وسط' کے معنی ہیں اعلیٰ و ارفع امت یا وہ امت جو راہِ اعتدال پر قائم ہے۔ اس کی ذمے داری یہ بتائی گئی ہے کہ وہ 'شہادت علی الناس' کا فرض انجام دے۔ یعنی انسانوں کے سامنے اسلام کے دینِ حق ہونے کی شہادت دے اور دلائل سے ثابت کرے کہ دنیا و آخرت میں نجات و فلاح کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ یہ فرض اللہ کے پیغمبر ہر دور میں کما حقہ ادا کرتے رہے ہیں۔ آخری رسول حضرت محمدؐ نے بھی اس فرض کو بدرجۂ کمال ادا فرمایا،

---

[1] اس کی تفصیل راقم کی کتاب 'معروف و منکر' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جس کے نتیجے میں یہ امتِ وسط وجود میں آئی۔ اب یہی فرض اس امتِ وسط کو تاقیامت انجام دیتے رہنا ہے۔

قرآن مجید کا حکم ہے کہ جو لوگ اللہ سے اور اس کے دین سے غافل ہیں انھیں جگایا جائے اور ان تک اللہ کا دین پہنچایا جائے۔ اسی لیے اس کا نزول ہوا ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ○ (یٰسٓ:٦)	تاکہ تم اس قوم کو (انجام بد سے) ڈراؤ جس کے باپ دادا کو ڈرایا نہیں گیا اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں خطاب رسولِ اکرم ﷺ سے ہے اور اہلِ عرب کے درمیان 'انذار' کا حکم ہے، جو زندگی کی غلط راہ پر دوڑے چلے جا رہے تھے اور جس کے بھیانک نتائج سے باخبر کرنے کے لیے کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا۔ یہ صورتِ حال آج بہت سی قوموں کی ہے، جن کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ صدیوں سے ان تک اللہ کا دین نہیں پہنچا ہے اور ان کے درمیان انذار کا فرض نہیں انجام پایا ہے۔ اب جب کہ سلسلۂ رسالت منقطع ہو چکا ہے اس امت ہی کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ دنیا کو اس کی غلط روی کے انجام سے آگاہ کرے اور بتائے کہ اللہ کی کتاب اسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ○ (سبا: ۲۸)	ہم نے تو آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

رسول اللہ ﷺ بشیر اس معنی میں ہیں کہ اللہ کے نازل کردہ دین کو

قبول کرنے پر آپ نے دنیا میں بہتر زندگی اور آخرت میں فلاح و کامرانی کی خوش خبری دی۔ آپ کو نذیر اس پہلو سے کہا گیا ہے کہ غلط فکر و عمل اختیار کرنے اور اللہ کے دین کو رد کرنے پر دونوں جہاں کے خسارے سے آپ نے آگاہ کیا اور اس کے بھیانک انجام سے ڈرایا۔

اسی طرح آپؐ کو ساری دنیا کے لیے رحمت قرار دیا گیا ہے:

وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ○ (الانبیاء: ۱۰۷)	ہم نے تو آپ کو سارے جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا وجود، آپ کی رسالت، آپ کا تصورِحیات، آپ کا نظام فکر و عمل اور آپ کی سعی و جہد دنیا کے لیے سراسر رحمت ہے۔ اسے رد کرنا اللہ کی رحمت سے خود کو محروم کرنا ہے۔ آج دنیا اس سے ناواقف ہے کہ آپ ساری دنیا کے لیے بشیر و نذیر اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ اسے دلائل سے ثابت کرنا امت کے فرائض میں ہے۔ اس سے غفلت پر اس سے باز پرس ہوگی۔

۷- موجودہ دور میں تبلیغ دین کا فرض مطلوبہ معیار سے انجام دینے کے لیے اس کے ذہنی و فکری رجحان کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اس وقت پوری دنیا پر ایک طویل عرصہ سے الحاد اور دہریت کی حکومت ہے۔ مغربی قوموں نے، جن کے ہاتھوں میں دنیا کی قیادت ہے، الحاد اور دہریت کو ایک فلسفۂ حیات کے طور پر اس طرح پیش کیا ہے کہ دین اور اس کی اساسی تعلیمات بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں۔ انسان کو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں، کسی بھی میدان میں اور کسی بھی قدم پر ان کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ نرسری میں جو بچہ داخلہ لیتا ہے، وہ بڑا ہوکر گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن تک تعلیم حاصل کرتا

ہے۔ اس سے آگے ریسرچ اور تحقیق کے مرحلہ میں بھی پہنچ جاتا ہے، لیکن اس کے سامنے کبھی وحی و رسالت یا آسمانی ہدایت کا سوال نہیں ابھرتا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک پاکستانی نوجوان سے، جو ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر ریسرچ کر رہا تھا، انھوں نے سوال کیا کہ ڈارون کی اس تھیوری کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا فی الواقع بندر نے ترقی کرکے انسان کی موجودہ ہیئت اختیار کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے، میں اسے نہیں مان سکتا۔ انھوں نے پوچھا: تمھارا مطالعہ اور تحقیق کیا کہتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ موجودہ تحقیق تو ڈارون ہی کے حق میں جاتی ہے۔ یہی حال تمام علوم و فنون کا ہے۔ آج تعلیم، تہذیب، تمدن، معیشت، قانون اور سیاست ہر شعبہ حیات کا رُخ الحاد نے متعین کیا ہے، جس میں خدا، وحی و رسالت اور آخرت جیسے مابعد الطبیعیاتی نظریات کہیں زیر بحث نہیں آتے اور کسی مسئلہ کے حل کے لیے ان کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ جب تک اس کی ضرورت ثابت نہ کی جائے موجودہ دور کا رُخ نہیں بدل سکتا۔

۸- دورِ جدید میں مذہب ایک انفرادی معاملہ ہوکر رہ گیا ہے۔ اجتماعی امور و معاملات سے اسے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ اسلام کو اگر کوئی شخص اپنے عقیدے کے طور پر اختیار کرے اور اپنی نجی زندگی میں اس پر عمل کرے تو شاید کسی کو اعتراض نہ ہو۔ لیکن اس کی اجازت کسی کو نہیں ہے کہ اجتماعی امور میں اسلام کی تعلیمات کو اپنائے اور ان کے مطابق اپنے معاملات طے کرے۔ اب یہ ثابت کرنا امت کی ذمے داری ہے کہ اسلام صحیح عقیدہ ہی فراہم نہیں کرتا، بلکہ اس کی بنیاد پر ہر شعبۂ حیات کے لیے نہایت فطری اور معقول ہدایات بھی پیش کرتا ہے۔ اس سے زندگی اس بے روی اور بے اعتدالی

سے محفوظ رہ سکتی ہے، جس میں وہ آج گرفتار ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی سبیل اسے نہیں نظر آرہی ہے۔ یہ ایک طویل اور ہمہ جہت عمل ہے۔ اسلام کی سربلندی کے لیے بہرحال اسے انجام دینا ہوگا۔

اسلام پر اعتراضات کی ایک طویل تاریخ ہے۔ آج تک بعض قدیم اعتراضات دہرائے جاتے ہیں۔ ان میں نئے اعتراضات کا اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان میں بالعموم جارحیت اور اسلام دشمنی صاف نمایاں ہوتی ہے۔ کبھی غیر جانب داری کے انداز میں کہا جاتا ہے کہ اسلام نے اپنے وقت میں مفید خدمات ضرور انجام دی ہیں، لیکن اس کی بہت سی باتیں اصلاح طلب ہیں۔ وہ آج قابل قبول نہیں ہیں۔ اس نے مساوات کی بات تو کی ہے لیکن بعض انسانوں کو جو حقوق دیے ہیں ان سے بعض دوسرے انسانوں کو محروم رکھا ہے۔ کسی وقت کہا جاتا تھا کہ اسلام اپنی فطری خوبیوں کی وجہ سے نہیں پھیلا، بلکہ تلوار کے زور سے اس کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔ اب اسلام کے ساتھ تشدد اور تخریب کو بھی جوڑ دیا گیا ہے کہ اسلام غارت گرِ امن و امان ہے۔ وہ اپنی صداقت دلائل سے نہیں ثابت کرتا بلکہ طاقت کے ذریعے اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس طرح کے اور بھی اعتراضات ہیں، جن کے ذریعے اسلام کی تصویر مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ دنیا کی اس طرف توجہ ہی نہ ہو لیکن اس میں خیر کا پہلو یہ ہے کہ اس نے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں ان کا جواب دیا جائے اور جن پہلوؤں سے اسلام سے بدظن کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ان پہلوؤں سے مطمئن کیا جائے اور اسلام کی حقانیت ثابت کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اہلِ علم اس

طرف متوجہ ہیں اور مفید خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن کام اتنا بڑا ہے کہ اس کا حق صحیح معنی میں اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ اس کے لیے پوری ایک جماعت کھڑی ہو جس میں مختلف صلاحیت کے افراد ہوں، جو منصوبہ بند اور منظّم طریقہ سے اسلام کا دفاع ہی نہ کرے بلکہ دنیا کے تمام نظریات کے مقابلہ میں اس کی برتری ثابت کرے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ترجیحاتِ دین کو سمجھنے اور اس کے مطابق راہِ عمل اختیار کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

(سہ ماہی 'تحقیقاتِ اسلامی' علی گڑھ، جنوری - مارچ ۲۰۰۸ء)

☆☆

اختلاف میں
عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑیے

موجودہ دور میں مسلم معاشرے کی جہاں بہت سی ترجیحات بدلی ہیں، اس کی دوستی، دشمنی، نصرت وحمایت اور عدل و انصاف کا پیمانہ بھی بدل گیا ہے۔ جب کسی سے اختلاف ہوتا ہے تو ہمارا پورا رویہ بدل جاتا ہے۔ اس کے اندر ہر طرح کی خرابیاں ہمیں نظر آنے لگتی ہیں اور اس کی کسی خوبی کو تسلیم کرنے کے لیے ہم آمادہ نہیں ہوتے۔ یہ عدل و انصاف کے سراسر منافی طرزِ عمل ہے۔ قرآن مجید کی صاف اور واضح ہدایت ہے کہ اختلاف اور عداوت میں بھی عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑا جائے۔

مشرکینِ عرب اہلِ ایمان سے برسرِ پیکار تھے اور جنگ جاری تھی۔ ان نازک حالات میں قرآن نے اپنے ماننے والوں سے کہا کہ وہ دنیا میں حق و انصاف کے علم بردار بن کر رہیں اور دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا معاملہ کریں۔ ان کی اشتعال انگیزی یا غلط حرکت کی وجہ سے وہ عدل کی راہ نہ چھوڑ بیٹھیں۔ ارشاد ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ

اے ایمان والو! اللہ کی خاطر ہمیشہ انصاف کے گواہ بن کر کھڑے رہو۔ کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ اُکسا دے کہ انصاف نہ کرو (ہر حال میں) انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے

اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ○ (المائدۃ:۸)

قریب تر رویہ ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

اس سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصحابِ تقویٰ اور خدا پرست انسانوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کرتے ہیں۔

یہ مشرکین کا ذکر تھا۔ یہود اسلام کی عداوت اور مخالفت میں مشرکین سے پیچھے نہیں تھے، آگے ہی تھے۔ ان کے متعلق قرآن نے جو رویہ اختیار کیا وہ اس کی ایک اور اعلیٰ مثال ہے کہ دشمن کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتے ہوئے حق و انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ارشاد ہے:

لَيۡسُوۡا سَوَآءً مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتۡلُوۡنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيۡلِ وَ هُمۡ يَسۡجُدُوۡنَ○ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ○ (آل عمران:۱۱۳-۱۱۴)

اہل کتاب سارے کے سارے ایک جیسے نہیں ہیں، بلکہ ان میں ایک جماعت حق پر قائم رہنے والی بھی ہے۔ یہ لوگ رات کے اوقات میں کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں۔ یہ صالحین میں سے ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ یہود دینِ اسلام کے، رسول اللہ ﷺ کے اور اہلِ اسلام کے بدترین دشمن تھے اور آج بھی وہ سب سے بڑے دشمن ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قدم قدم پر دھوکہ دہی کا معاملہ کیا اور آپ ﷺ کو نقصان پہنچانے اور اذیت دینے کی کوششیں کیں۔ آپ ﷺ ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو ان سے معاہدہ کیا کہ وہ مدینے کی حفاظت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے اور آپ کے کسی دشمن کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کریں گے، لیکن انھوں نے اپنے وعدے کا کبھی پاس و

لحاظ نہیں کیا، دشمنوں کو اسلام کے خلاف اکساتے رہے اور جب بھی کوئی نازک موقع آیا، دشمنوں کی صف میں کھڑے ہوگئے۔ ہر وقت رسول اللہ ﷺ کی جان کے درپے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپ ﷺ کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ کو کھانے کی دعوت دی تو کھانے میں زہر ملا دیا، آپ ﷺ کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ کھانے میں کوئی غلط چیز ملا دی گئی ہے۔ چناں چہ آپ نے ہاتھ روک لیا۔ اس کے اثرات آپؐ پر زندگی کے آخری ایام تک باقی رہے۔ اس کھانے کی وجہ سے آپ کے ایک صحابی کا انتقال ہوگیا۔ اسی طرح ایک دفعہ آپؐ کو انھوں نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور تدبیر یہ کی کہ آپ پر اوپر سے کوئی بھاری پتھر گرادیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آپ کو ان کی سازش سے باخبر کردیا۔ آپ وہاں سے ہٹ گئے اور وہ اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ یہودیوں کی بدعہدیوں، زیادتیوں اور دشمنی کے کتنے ہی ایسے واقعات ہیں جو تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور خود قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ صرف قرآن میں ان کی جو زیادتیاں بیان ہوئی ہیں، اگر ان کی تفصیلات جمع کردی جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے گی۔ ارشاد ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ
(المائدۃ:۸۲)

یقیناً آپ یہودیوں اور مشرکوں کو ایمان والوں کا سب سے زیادہ دشمن پائیں گے۔

مزید فرمایا کہ دینِ اسلام سے ان کی نفرت، رسول اللہ اور اہلِ ایمان سے ان کی عداوت اور دشمنی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۚ
(آل عمران:۱۱۸)

(ان کا) بغض و حسد تو خود ان کی زبان سے ظاہر ہو رہا ہے، اور جو ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔

یہود کی کھلی عداوت اور ان کی ساری اخلاقی کم زوریوں کے باوجود ان کے

بارے میں اوپر کی آیات میں کہا گیا ہے:

'لَیۡسُوۡا سَوَآءً مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتَابِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ' یعنی سارے کے سارے اہلِ کتاب ایک جیسے نہیں ہیں اور ان کا بچہ بچہ اور ہر ہر فرد، غلط اور بگڑا ہوا نہیں ہے۔ ان اہلِ کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو اللہ کے دین پر قائم ہیں۔ اللہ سے جو وعدہ کیا ہے، اس پر جمے ہوئے ہیں۔ یہ محض ظاہری طور پر نہیں بلکہ صحیح معنی میں اللہ کے بندے ہیں۔ 'یَتۡلُوۡنَ آیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیۡلَ' یعنی وہ رات کے اوقات میں اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔ ساری دنیا، جب خواب غفلت میں پڑی رہتی ہے اور میٹھی نیند سوتی ہے، وہ اللہ کی یاد میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ 'وَهُمۡ یَسۡجُدُوۡنَ' اللہ کے دربار میں سجدہ ریز ہوتے اور نماز ادا کرتے ہیں۔ 'یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ' اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، دنیا داروں کی طرح انھوں نے اللہ اور آخرت کو فراموش نہیں کر دیا ہے۔ 'یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ' لوگوں کو بھلائیوں کی تعلیم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ دوسروں کو رسول اللہﷺ پر نازل کردہ کتاب قرآن مجید اور آپ کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپؐ کے ساتھ جو زیادتیاں ہوتی ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور غلط کاروں کو ٹوکتے ہیں۔ وَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرَاتِ: نیکی کے کاموں میں وہ سبقت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ یہ لوگ اللہ کے نزدیک صالح ہیں۔ ان کا شمار نیکوکاروں میں ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

وَمَا یَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلَنۡ یُّكۡفَرُوۡهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ○ (آل عمران:۱۱۵)

یہ لوگ نیکی اور بھلائی کا جو بھی کام کریں گے، اللہ اس کی قدر کرے گا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تقویٰ والوں کو۔ (کون اس سے ڈر کر زندگی گزار رہا ہے کون ریاکاری کر رہا ہے)

اسی طرح ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّہٖۤ اِلَیْکَ وَ مِنْھُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّہٖۤ اِلَیْکَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَیْہِ قَآئِمًا۝

(آل عمران:۷۵)

بعض اہلِ کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انھیں تم خزانے کا امین بنا دو تو بھی وہ تمھیں واپس کردیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ایک دینار بھی ان کی امانت میں دے دے تو وہ تمھیں واپس نہ کریں۔ ہاں، یہ اور بات ہے کہ تم ان کے سر پر سوار اور اپنی بات پر جمے رہو۔

دشمنوں کے ساتھ اہلِ ایمان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے باغی ہیں اور جو دین کو مٹا دینا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے؟ یہ ساری باتیں ان آیتوں میں بیان ہوئی ہیں اور مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کوئی گروہ دشمن ہو تو بھی اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ ہونا چاہیے۔ ان کی خوبیوں کا اعتراف اور اچھائیوں کو تسلیم کرنا چاہیے۔ ان کی ہر بات اور ہر فرد کی مخالفت کرنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ متقیوں کی ایک نمایاں خوبی دشمنوں کے ساتھ انصاف کرنا بھی ہے۔ اس طرح وہ اپنی اخلاقی برتری ثابت کرتے ہیں۔

رسول اللہ نے ایک مرتبہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ ان میں ایک نصیحت یہ بھی تھی 'کلمة الحق فی الغضب و الرضا' (حق بات کہو چاہے غصے کی حالت ہو یا خوشی کی) یہ نہ ہو کہ کسی سے دشمنی ہے تو غلط بات کہہ بیٹھو، اور کسی سے دوستی ہے تو اس کی خاطر انصاف سے ہٹ جاؤ، یہ بہت اہم بات ہے۔ کیوں کہ آدمی غصے کی حالت میں حق کا دامن تو چھوڑ ہی دیتا ہے، خوشی میں بھی چھوڑ بیٹھتا ہے۔

یہ تفصیل اس لیے عرض کی گئی کہ ہم اور آپ اپنا جائزہ لیں کہ کیا ہم بھی مخالفین

کے ساتھ عدل و انصاف کا وہی رویہ اختیار کرتے ہیں، جس کی قرآن و حدیث میں تعلیم دی گئی ہے؟ اُن لوگوں کو جانے دیجیے جو اللہ اور رسولؐ اور دین اسلام کے دشمن سمجھے جاتے ہیں، جو کافر و مشرک کہے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں تو شاید ہی خیال آتا ہو کہ ان کے اندر بھی کوئی خوبی ہوگی۔ ذرا اپنی ملت کے افراد کے بارے میں سوچیے جن کو اسلام نے بھائی بھائی کہا تھا اور رسول اللہ نے آخری خطبے میں وصیت کی تھی:

إن دماء كم و أموالكم و	تمھاری جان، تمھارے مال اور تمھاری عزت
أعراضكم حرام عليكم كحرمة	و آبرو، سب ایسے ہی محترم ہیں، جس طرح
يومكم هٰذا في شهركم هٰذا و	تمھارا آج کا یہ دن تمھارے اس مہینہ اور اس
في بلدكم هٰذا (بخاری و مسلم)	شہر میں محترم ہے۔

مطلب یہ کہ جس طرح تم آج کے دن کی اس مبارک مہینے اور اس مبارک شہر میں عزت و احترام کرتے ہو، اسی طرح اُمت کے افراد کی جان، مال اور عزت و آبرو کا احترام کرو، لیکن یہاں حال یہ ہے کہ اگر کسی سے ذرا اختلاف ہو تو اس کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی خوبی ہی نظر نہیں آتی، خواہ وہ کتنا ہی متقی اور نیکوکار ہی کیوں نہ ہو۔ یہی معاملہ جماعتوں اور گروہوں کا ہے۔ اگر ہمارا یا آپ کا کسی جماعت سے تعلق اور وابستگی ہے تو تمام خوبیاں اس کے اندر نظر آتی ہیں، اور کسی جماعت سے اختلاف ہے تو اس میں خامیاں ہی خامیاں ہم دیکھنے لگتے ہیں اور بے بنیاد باتیں بھی اس کی طرف منسوب کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ یہ رویہ قطعاً درست نہیں ہے۔ اس لیے تاکید کی گئی ہے کہ آدمی ہر معاملے میں حق پر قائم رہے۔ عدل و انصاف کی بات کرے، دشمن بھی سنے تو کہے کہ یہ انصاف کی بات ہے۔ اسی طرح ہماری ایک کمزوری یہ ہے کہ ہم فرد اور جماعت میں فرق نہیں کرتے۔ فرض کیجیے کہ کسی جماعت کے ایک فرد نے کوئی غلط عمل کیا۔ یہ اس کا ذاتی عمل ہے۔ خرابی کسی فرد کے اندر ہو سکتی ہے، اس کی وجہ سے پوری جماعت کے بارے میں غلط فیصلہ کرنا اور اسے بدنام کرنا،

ناروا ہے۔ جب ہمارے کچھ مسلمان بھائی غلط کام کرتے ہیں تو مسلم دشمن افراد اور جماعتیں یہی حرکت کرتی ہیں۔ وہ تمام مسلمانوں ہی کو بدنام کرنے لگتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں: مسلمانوں میں اگر کچھ بگڑے ہوئے لوگ ہیں تو سارے مسلمانوں پر کیوں الزام لگاتے ہو؟ اور یہ صحیح بھی ہے۔ اس کا خیال ہمیں خود بھی رکھنا چاہیے۔ صحیح حدیث ہے رسول اللہ نے فرمایا کہ "کوئی مسلمان اگر کسی مسلمان کو کافر کہے، فاسق کہے یا خدا کا دشمن کہے اور وہ فی الواقع ایسا نہیں ہے تو یہ سارے الزامات اس پر پلٹ کر آجائیں گے، وہ خدا کے پاس فاسق و فاجر اور کافر ٹھہرے گا۔" (بخاری و مسلم)

ہمیں اور آپ کو اس پہلو سے سوچنا چاہیے اور قرآن و حدیث میں جو احکام و ہدایات دیے گئے ہیں، ان پر غور کرنا چاہیے۔ قرآن و حدیث میں زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں ہدایت موجود ہے، اس سے ہمیں اپنی زندگی کو سنوارنا چاہیے اور ہر موقع پر حق بات کہنی چاہیے۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ "اگر کسی مسلمان کی عزت و آبرو پر حملہ ہو رہا ہو اور کوئی مسلمان اس کا دفاع کرسکتا ہو، اس کے باوجود دفاع نہ کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اس وقت اس کی کوئی مدد نہ کرے گا، جب کہ وہ اس کی مدد کا زیادہ محتاج ہوگا۔" (ابوداؤد)

اسی طرح اگر کسی جماعت کے اوپر حملہ ہو رہا ہو اور اسے رسوا کیا جا رہا ہو، اس کے دفاع کے موقف میں ہونے کے باوجود کوئی اس کا دفاع نہ کرے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب طلب ہوگا، اور اس سے بازپرس ہوگی۔ اس لیے کہ ایسے موقعے پر دفاع واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں کہی گئی ہیں، ان پر مزید غور کرنے اور فائدہ اٹھانے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(ماہ نامہ زندگی نو۔ نئی دہلی۔ اگست ۲۰۰۱ء)

☆☆

اصلاحِ امت

قرآن و حدیث راہنمائی کرتے ہیں

(۲۶/اکتوبر ۱۹۹۶ء کو انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ کی طرف سے جامعہ کے وسیع میدان میں خطاب عام کا پروگرام تھا۔ اس میں جو تقریر کی گئی اس کے بعض ضروری نکات کو یہاں مرتب کر کے پیش کیا جا رہا ہے)

اس امت کا آغاز ہم سب جانتے ہیں، اس طرح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فیصلہ کے تحت سرزمینِ عرب میں اپنے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کو پیدا فرمایا۔ اس وقت یوں تو پورے کرۂ ارض پر ضلالت و گمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے، لیکن اہلِ عرب اس معاملہ میں اور بھی کئی قدم آگے تھے۔ جہالت عام تھی، علم و فن میں ان کا کوئی مقام نہ تھا، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی حیثیت سے انھیں کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کے کسی گوشہ میں وہ پڑے ہوئے ہیں اور کسی کو ان سے اور ان کے جزیرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایسی آبادی میں اور ایسے ملک میں رسول اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی اور اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید نازل ہوئی۔

رسولِ اکرم ﷺ نے اہلِ مکہ کے سامنے قرآن مجید پیش فرمایا اور کہا کہ دیکھو یہ اللہ کی کتاب ہے، اس سے تم اپنی زندگی میں رہ نمائی حاصل کر سکتے ہو، یہ تمھیں سیدھا

راستہ دکھائے گی اور دنیا و آخرت کی فوز و فلاح سے ہم کنار کرے گی۔ خدائے واحد کو ماننا اور اس بات کو تسلیم کرنا کہ وہ ہماری ہدایت اور رہ نمائی کرتا ہے اور یہ ہدایت آخری رسول محمد ﷺ کے ذریعہ آئی ہے، تمھارے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہیں کھول دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے قریش مکہ سے فرمایا میں تمھارے سامنے ایک کلمہ پیش کر رہا ہوں۔ وہ کلمہ ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یعنی اس بات کا اقرار کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق و مالک ہے، وہی اس کا فرماں روائے مطلق ہے اور اسی کا حکم یہاں ہر طرف چل رہا ہے، وہی سب کا معبود و مسجود ہے، وہ ہر دور میں انسان کی ہدایت کرتا رہا ہے اور اب اس نے محمد ﷺ کو ہدایت دے کر بھیجا ہے۔ آپ ﷺ اللہ کے رسول اور فرستادہ ہیں اور اس کی ہدایت انسانوں تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ ہے اس کلمہ کا خلاصہ۔ اس حقیقت کو اگر تم تسلیم کر لوگے تو اے اہلِ مکہ سارا عرب تمھارے سامنے سرنگوں ہوجائے گا، عجم تمھارا باج گزار ہوگا اور دنیا پر تمھارا اقتدار قائم ہوگا۔ آج تمھاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ تم میں سے کوئی اپنے خاندان کا بڑا ہے، کوئی اپنے قبیلہ کا سردار ہے، لیکن دنیا میں تمھارا کوئی مقام نہیں ہے، اگر اس کلمہ کو تسلیم کرلوگے تو دنیا کی فرماں روائی تمھیں حاصل ہوگی اور تم کامیاب و کام راں بن کر رہوگے۔

یہ وہ تصور تھا جو رسول اکرم ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا۔ اس طرح اس آبادی میں جو ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی تھی، جسے کہیں سے روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی اور وہ سیدھا راستہ دیکھ نہیں پا رہی تھی، شمع ہدایت روشن فرمائی اور حق و صداقت قبول کرنے کی دعوت دینی شروع کی۔

عرب کے اس ظلمت زدہ ماحول سے صحیح الفطرت افراد نکل رہے تھے اور سیرت و کردار کے اس سانچے میں ڈھل رہے تھے جو محمد عربی ﷺ نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ ان میں کا ہر فرد اس سانچے میں اس طرح ڈھل رہا تھا جیسے یہ سانچہ اسی کے لیے بنا ہو۔ اس میں ذرہ برابر کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آنے والے مرد بھی تھے عورتیں بھی

تھیں، امیر بھی تھے غریب بھی تھے، بچے بھی تھے جوان اور بوڑھے بھی تھے۔ یہ سب مل کر عقیدہ اور عمل کی ایک خاص تصویر بنا رہے تھے۔ یہ تصویر ان کی پہلی تصویر سے بالکل مختلف تھی۔ اس میں جہالت اور جاہلیت کی جگہ ہدایت کا نور جگمگا رہا تھا۔

اس طرح ایک نیا انسان وجود میں آ رہا تھا۔ وہ کفر و شرک میں مبتلا تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے انھیں کفر سے نکالا اور توحید کا درس دیا، وہ بہت سے خداؤں کی پرستش کر رہے تھے، آپ نے انھیں بتایا کہ عبادت تو صرف اللہِ واحد کی ہوسکتی ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے۔ ان کے درمیان بے شمار جھگڑے اور آپس کے اختلافات تھے، خوں ریزیاں ہو رہی تھیں، ان سب کو ختم کر کے اخوت کے دھاگہ میں انھیں پرویا اور بکھرے ہوئے انسانوں کو ایک وحدت بنایا۔ اس کو امتِ مسلمہ کا نام دیا گیا۔

قرآن کہتا ہے کہ جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے، اس کی زندگی کا رُخ متعین ہوجاتا ہے اور اس کے سیرت و کردار میں تبدیلی آجاتی ہے۔ خدا کو ماننا یا اس کا انکار کوئی سادہ بات نہیں ہے، بلکہ اس کے بڑے دور رَس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر آدمی صحیح معنی میں خدا پر ایمان لے آئے تو اس کی زندگی کا ایک رخ متعین ہو جاتا ہے۔ اس کا عقیدہ، اس کا اخلاق، اس کے معاملات، اس کے تعلقات، اس کی معاشرت اور اس کا رہن سہن سب اس کے تابع ہو جاتے ہیں اور جو شخص خدا کا انکار کردے، اس کی زندگی کا رُخ دوسرا ہوتا ہے۔ دونوں اسی دنیا میں رہتے ہیں، انسان ہونے کے ناطے ان میں بہت سی باتیں مشترک بھی ہوتی ہیں لیکن نقطۂ نظر کا فرق ان کے سمتِ سفر کو بدل دیتا ہے۔

قرآن مجید نے جگہ جگہ بتایا ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد کس طرح کی پاکیزہ زندگی وجود میں آتی ہے اور یہی در حقیقت کامیاب زندگی ہے۔ مکہ میں ایمان لانے والے بہت تھوڑے تھے، جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ یہ سخت آزمائشوں اور امتحانات سے گزر رہے تھے، لیکن ایمان دل میں اتر چکا تھا، اس لیے کسی آزمائش کی وجہ سے ان کی زندگی کا رخ نہیں بدلا۔ ہر امتحان میں انھوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔

اس نازک ترین دور میں جب اس قافلہ نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا تو کوئی شخص تصور نہیں کرسکتا تھا کہ یہ کبھی اپنی منزلِ مقصود کو پہنچے گا، لیکن قرآن نے پورے وثوق اور اعتماد سے کہا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ (المومنون:۱) بے شک فلاح پا گئے ایمان والے۔

دنیا حیرت سے کہہ رہی تھی کیا یہ فلاح یاب ہیں، کیا ان کو کامیاب کہا جارہا ہے جو اپنی زندگی تباہ کر رہے ہیں، جو ہر لطفِ حیات سے محروم ہیں، جن کو عسرت اور تنگ دستی نے بدحال کر رکھا ہے، جو دبائے اور کچلے جارہے ہیں، جن کے خلاف پوری بستی کھڑی ہوئی ہے، جن کے پیچھے کوئی طاقت نہیں ہے۔ ان حالات میں قرآن نے کہا:

نادانو! کامیاب وہ نہیں ہیں جو آج عیش و طرب میں مست ہیں، جو خواہشاتِ نفس کے پیچھے دوڑے چلے جارہے ہیں، جو خدا کو اور اس کی قوت و اقتدار کو بھولے ہوئے ہیں، جن کی نگاہیں اس دنیا سے آگے کی حقیقتوں کو نہیں دیکھ رہی ہیں، بلکہ کامیاب انسانوں کی خصوصیات کچھ اور ہی ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ○ (المومنون:۲) وہ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

یعنی کامیاب وہ ہیں جو نماز پڑھتے اور اللہ کو یاد کرتے ہیں، جو اس کے سامنے اپنا سر نیاز خم کر دیتے ہیں۔ ان کی نماز غفلت کی نماز نہیں ہوتی بلکہ وہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ ان کا ظاہر و باطن خدا کے سامنے جھک جاتا ہے۔ اعضا و جوارح کے ساتھ دل و دماغ بھی خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

ان کی سیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ○ (المومنون:۳) وہ لغویات سے اعراض کرتے ہیں۔

کامیاب انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ لغو اور فضول کاموں سے دور رہتا ہے، بلکہ اس کی طرف رخ بھی نہیں کرتا۔ لغویات میں وہ شخص مبتلا ہوتا ہے جو آخرت سے بے فکر ہو اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ جس انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصدِ حیات نہ ہو اسی کو دنیا کے کھیل تماشہ سے دلچسپی ہوگی، لیکن جس کے سامنے یہ تصور ہو کہ زندگی تیزی سے گزر رہی ہے، اور اس طرح گزر رہی ہے کہ نہیں معلوم کب مہلتِ حیات ختم ہو جائے، اس کے لیے اس کا موقع نہیں ہے کہ وہ لغویات میں دلچسپی لے۔ قرآن نے کہا یہ لوگ اعلیٰ مقاصد کے لیے جی رہے ہیں، انھیں لہو ولعب اور بے مقصد کاموں سے دلچسپی نہیں ہوسکتی۔

آگے کہا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ○ وہ زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔

(المومنون:۴)

مطلب یہ کہ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ دولت خرچ ہوتی ہے عیش وعشرت کے لیے، عیاشی کے لیے، شہرت کے لیے، نام ونمود کے لیے، جاہ وعزت کے لیے، لیکن یہ اللہ کے بندے ہیں ان کی دولت اللہ کی رضا کے لیے اور اس کی مرضی کے مطابق صرف ہوتی ہے اور ہمیشہ صرف ہوتی رہتی ہے۔

ان کی خوبی یہ بھی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

(المومنون:۵)

یعنی یہ اپنی عزت و ناموس کے محافظ ہیں۔ ان کے دامن پر کبھی بدکاری کے دھبے نہیں دیکھے جاسکتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ راہب ہیں اور انھوں نے دنیا چھوڑ رکھی ہے، اس لیے ارشاد فرمایا:

اِلَّا عَلٰٓی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ○ (المومنون:٦)

ہاں اپنی بیویوں یا باندیوں سے اپنی خواہش کی تسکین کرتے ہیں۔ اس میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں۔

یعنی وہ راہب اور جوگی نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے گھر ویران نہیں کر رکھے ہیں، بلکہ ان کے گھر آباد ہیں، وہ بیوی بچے والے ہیں۔ اپنی جنسی خواہش جائز طریقہ سے پوری کرتے ہیں۔ اس کے لیے بدکاری کی راہ اختیار نہیں کرتے۔

آگے ارشاد ہوا:

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ○ (المومنون:٨)

وہ اپنی امانتوں اور عہد و پیان کی حفاظت کرتے ہیں۔

مطلب یہ کہ ایک ایسے ماحول میں جہاں کسی کا مال محفوظ نہیں ہے، جہاں لوٹ مار عام ہے اور جہاں عہد و پیمان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہاں دیکھو کہ یہ لوگ امانت دار اور دیانت دار ہیں، جس سے جو وعدہ کرتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں، ان کی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے، وہ جب کسی کو زبان دیتے ہیں تو اس کی پاس داری کرتے ہیں۔

یہ سورۃ المومنون کی آیات ہیں۔ اہلِ ایمان کی اور خوبیاں قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ ان کے ذریعہ اس نے بتایا کہ ایمان کے بعد انسان کے سوچنے کے انداز اور سیرت و کردار میں عظیم انقلاب رونما ہوتا ہے۔ مکہ کے بگڑے ہوئے ماحول میں جو لوگ ایمان لا رہے تھے ان کی زندگی قرآن کے اس دعوے کی عملاً تصدیق کر رہی تھی۔ کسی کو یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ قرآن جو کردار پیش کر رہا ہے وہ کہاں ہے اور ہمیں کیوں نظر نہیں آ رہا ہے؟ ہر صاحبِ ایمان اس کا عملی نمونہ تھا اور مخالفین اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ اس طرح یہ چند نفوس اللہ سے اپنے مضبوط تعلق، اپنے انداز فکر، اپنے اخلاق و کردار اور انسانوں سے تعلقات اور معاملات میں بالکل ممتاز اور نمایاں تھے۔ ماحول ان کی مخالفت کر سکتا تھا لیکن ان کی اخلاقی بلندی سے انکار کی جرأت وہ اپنے اندر نہیں پا رہا تھا۔

یہ زبردست انقلاب تھا جو قرآن کے ذریعہ رونما ہوا۔ اس نے کام یاب انسان کا تصور ہی نہیں دیا بلکہ کام یاب انسان پیدا کر دکھائے۔

عقیدہ و عمل کا یہ حسین اجتماع کسی دوسرے معاشرے میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس طرح اللہ کی کتاب کی بنیاد پر یہ امت وجود میں آئی اور اس کے مطابق اس کی سیرت سازی ہوئی اور وہ بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ دنیا اس کی پیش قدمی کو روک نہ سکی اور اس کی امامت و قیادت تسلیم کرلی گئی۔ یہ ہے اس امت کی تاریخ۔ اس کی روشنی میں ہمیں اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اسلام کا اسی طرح نمونہ پیش کر رہے ہیں، جس طرح اس کے ابتدائی دور میں پیش ہوا تھا؟ کیا ہم عبادات، اخلاق و معاملات اور آپس کے تعلقات میں قرآن کی اس طرح اتباع کر رہے ہیں جس طرح اس کی اتباع ہونی چاہیے؟ کیا کسی بھی پہلو سے ہماری زندگی اسلام کی عملی ترجمانی کر رہی ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام پر اور اس کی تعلیمات پر ہمارا ایمان ویقین کم زور ہے۔ اس سے پوری زندگی متاثر ہے۔ ہماری سیرت و کردار اپنا حسن کھو چکی ہے، اس میں اب کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے۔ ہم نے اس پاکیزہ معاشرت کو جو ہمیں ملی تھی، اس پاکیزہ تہذیب کو جس میں ہمارے اسلاف کی پرورش ہوئی تھی چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ جب تک ہماری سیرت و کردار اور تہذیب و معاشرت مضبوط نہ ہو سماج میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی۔ داخلی طور پر مستحکم قومیں ہی خارجی حملوں کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔

جب تک ہماری تہذیب، ہمارا معاشرہ، ہماری سوسائٹی، ہمارا سماج اسلام کے قالب میں نہ ڈھل جائے، اسلام اس کی زندگی میں اتر نہ جائے اس وقت تک یہ توقع نہیں کہ اسلام غیر اسلام کا متبادل ہو سکے گا۔ فرد کی زندگی میں اور سماج اور معاشرہ میں جہاں اسلام موجود نہ ہوگا وہاں غیر اسلامی فکر اور تہذیب کا نفوذ ہوگا اور وہ اسے کم زور کرتا رہے گا۔ یہی ہو رہا ہے۔ ہمارے اسلاف اگر دنیا پر چھا گئے تو اس لیے کہ وہ داخلی طور پر مستحکم تھے۔ ایسے مستحکم کہ کوئی رخنہ نہیں تھا جس سے دشمن گھس سکے۔ اور اگر دشمن کو

آپ دراندازی کا موقعہ دیتے ہیں تو وہ آپ کی صفوں میں داخل ہوگا اور کم زور کرتا رہے گا۔ چناں چہ یہی ہو رہا ہے۔ غیر اسلامی افکار و خیالات ہمارے اندر جگہ بنا رہے ہیں، ہم اپنی تہذیب اور کلچر سے محروم ہو رہے ہیں اور ہماری شناخت ختم ہو رہی ہے اور دنیا کی قوموں میں ہماری کوئی انفرادیت نظر نہیں آرہی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اتنے مضبوط ہوجائیں کہ غیر اسلامی فکر اور تہذیب کی یلغار کو روک سکیں، بلکہ اس کی جگہ اسلامی فکر اور تہذیب کو اپنے حسنِ عمل سے اس طرح پیش کریں کہ دنیا اس کی طرف خود بہ خود کھنچنے لگے۔ اس کا نسخہ قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ پوری امت کے اندر محبت اور موالات کا تعلق ہو اور وہ اپنے اندر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتی رہے۔ ارشاد ہے:

وَالْمُؤمِنُوْنَ وَالْمُؤمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبۃ:۷۱)

ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ایمان والے مرد اور عورتیں سب ایک دوسرے کے دوست اور غم خوار ہیں۔ یہ سب ایک مقصد کے ساتھی ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینے والے، ایک دوسرے سے قلبی تعلق رکھنے والے اور ایک دوسرے کی سرپرستی کرنے والے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ:۷۱)

یہ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں۔

مطلب یہ کہ یہ ایک دوسرے کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں۔ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' ہی وہ ذریعہ ہے جس سے بگاڑ ختم ہوگا اور فساد دور ہوگا۔ اور آپ کا معاشرہ ایک پاکیزہ معاشرہ بنے گا۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس امت کی اصلاح باہر کے کسی فرد یا گروہ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اسے خود اپنی اصلاح کی فکر کرنی ہوگی۔ اس کے لیے اس امت کے اندر اس شعور کو زندہ کرنا ہوگا کہ وہ خود اپنی

اصلاح کی فکر کرے۔ اس کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی اصلاح کرے۔ اس کا ایک فرد دوسرے فرد کی اصلاح کرے۔ اس کا ایک بھائی دوسرے بھائی کی اصلاح کرے۔ اس کی ایک بہن دوسری بہن کی اصلاح کرے۔ تب امت کی اصلاح ہوگی۔

رسولِ خداﷺ نے فرمایا ''الدین النصیحة'' دین نصیحت اور خیر خواہی کا نام ہے۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: یہ خیر خواہی کس کے ساتھ ہو؟ آپؐ نے فرمایا:

للّٰہ و لرسولہ و لکتابہ ولِائمۃ المسلمین و عامتھم (مسلم)

اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اس کی کتاب اور مسلمانوں کے ائمہ اور ان کے عوام کے ساتھ۔

پہلی خیرخواہی خدا کے ساتھ ہوگی۔ علماء نے لکھا ہے کہ خدا کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ آدمی کا عقیدہ صحیح ہو اور اس کی اطاعت و بندگی اس طرح کرے جس طرح اس کا حکم ہے۔

اللہ کے رسول کے ساتھ خیرخواہی یہ ہے کہ آپ سے محبت اور اخلاص کا تعلق ہو، آپ کے احکام کی اطاعت اور فرماں برداری کی جائے، اور آپ کی سیرت کو نمونہ بنایا جائے اور اس کی اتباع کی جائے۔

اللہ کی کتاب کے ساتھ خیرخواہی یہ ہے کہ اس کی تلاوت ہو، اس پر غور وفکر ہو، اس سے راہنمائی حاصل کی جائے، اس کی تبلیغ کی جائے اور اس کے پیغام کو عام کیا جائے۔ اور دنیا میں اسے نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔

ائمہ مسلمین کے ساتھ خیرخواہی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات کے جو ذمہ دار ہیں اور جو ہمارے امام ہیں بھلائی کے کاموں میں ان کی مدد کی جائے۔ ان سے بھول چوک یا غفلت ہو تو متنبہ کیا جائے اور انھیں راہِ راست دکھائی جائے۔

مسلمانوں کے عوام کے ساتھ خیرخواہی یہ ہے کہ ان میں کے ہر فرد کے ساتھ خیرخواہی کی جائے۔ اس کا ہر شخص یہ محسوس کرے کہ چاروں طرف اس کے خیر خواہ ہیں،

جو امور خیر میں اس کے ساتھ تعاون کریں گے اور وہ غلط قدم اٹھائے تو اسے اس سے باز رکھیں گے۔

خیرخواہی پیسے سے بھی ہوتی ہے اور دعوت وتبلیغ کے ذریعہ بھی۔ نیکی کا راستہ دکھانا اور برائی سے روکنا یہ بھی خیرخواہی ہے صحیح حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

انصر اخاک ظالما او مظلوما تمھارا بھائی ظالم ہو یا مظلوم اس کی مدد کرو۔

صحابہ کرامؓ نے فرمایا:

فھذا ننصرہ مظلوماً فکیف ننصرہ ظالما جب وہ مظلوم ہو تو ہم اس کی مدد کرتے ہیں۔ وہ ظالم ہو تو کیسے مدد کریں؟ (بخاری)

مطلب یہ ہے کہ مظلوم اگر ہے تو ہم اس کی مدد کرتے ہی ہیں وہ ظالم ہو تو اس کی کیا مدد کی جائے۔ آپؐ نے فرمایا: اس کا ہاتھ پکڑلو اور اسے ظلم کرنے نہ دو۔ ظلم سے اسے روک دینا اس کی مدد ہے۔

یہ راستہ اس لیے دکھایا گیا کہ جب تک یہ امت داخلی طور پر مضبوط نہ ہوگی اس کے وجود کا اور اس کے برپا کیے جانے کا مقصد پورا نہ ہوگا۔ یہ امت دنیا کو راہ حق دکھانے اور اس پر چلانے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ داخلی طور پر مضبوط نہ ہوجائے۔ جب تک دین خود اس کے اندر نافذ نہ ہوجائے۔ وہ دوسروں پر اللہ کا دین قائم نہیں کرسکتی۔

یہ ہے وہ راستہ جو قرآن نے اور حدیث نے دکھایا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس راستہ پر چلنے اور اس پر عمل کرنے اور اس امت کو مستحکم کرنے کی اور ہمارے اندر جو کم زوریاں ہیں ان کو دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(ماہ نامہ 'حیاتِ نو' بلریا گنج، خصوصی شمارہ، چھٹا اجلاس عام نمبر۔ نومبر-دسمبر ۱۹۹۶ء اور جنوری-۱۹۹۷ء جلد ۱۲، شمارہ ۸)

اصلاحِ اُمت میں علماء کا کردار

(موجودہ حالات کے پس منظر میں)[1]

یہ موضوع بڑا وسیع ہے۔ مختلف جہتوں سے اس پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ مختصر الفاظ میں علماء کی دینی ذمے داری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ امت کی قیادت و رہ نمائی کا فرض انجام دیتے رہیں۔ اس وقت بھی انھیں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ موجودہ دور میں ہندستانی مسلمان بے شمار مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان میں داخلی مسائل بھی ہیں اور خارجی مسائل بھی۔ ان میں سے بعض مسائل وہ ہیں جن کا تعلق صرف ہمارے ملک ہندستان ہی سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں سے ہے۔ اس وقت ان کے بعض داخلی اور خالص دینی مسائل کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱- ہندستان میں مسلمانوں کا ایک مسئلہ جو خاص توجہ کا طالب ہے، یہ ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد صحیح عقیدہ اور صحیح اسلامی فکر سے محروم ہے۔ اسے نہیں معلوم ہے کہ اسلام نے توحید کا کیا تصور دیا ہے اور کس طرح شرک

---

[1] ۲۴، ۲۵ر نومبر ۲۰۰۴ کو جامعہ دار السلام عمر آباد میں اساتذہ کرام کا دو روزہ تربیتی اجتماع تھا۔ اس اجتماع میں راقم نے مذکورہ بالا عنوان پر جو تقریر کی تھی اسے یہاں مرتب کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

سے اسے پاک کیا ہے۔ اس کی وضاحت دلائل کے ساتھ ہونی چاہیے اور پھر اس کے تقاضے پوری قوت کے ساتھ سامنے آنے چاہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اسی کو معبودِ برحق اور مطاعِ مطلق سمجھے، اس کی تقدیس اور عظمت اور قدرت کا زندہ احساس اس کے اندر پایا جائے، اس کی فرماں روائی کا تصور دل و دماغ میں پیوست ہو، کسی کو اس سے برتر اور نہ اس کا ہمسر سمجھے، صرف اس کی خشیت اس کے نہاں خانۂ دل میں موجود ہو، اس کے علاوہ کسی سے خوف کھائے اور نہ ڈرے، کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا نہ سمجھے اور اپنی ساری امیدیں اسی سے وابستہ رکھے۔ اسلام جس طرح کی تبدیلی لانا چاہتا ہے وہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ آدمی کا سینہ اس ایمان و یقین سے مالا مال نہ ہو کہ اللہ ہی پوری کائنات کا مالک ہے۔ ہر چیز اس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔ ہماری زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اسی کی مرضی سے جی رہے ہیں۔ وہ جب چاہے گا ہماری مہلتِ حیات ختم ہوجائے گی اور ہم اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ ایمان و یقین کی یہ کیفیت اس امت کے اندر صحیح معنوں میں موجود نہیں ہے اور ہے تو غیرواضح اور دبی ہوئی ہے۔ حالاں کہ اسے بالکل واضح ہونا اور دل و دماغ پر چھا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ پورے دین اور شریعت کی جان ہے۔ یہ پوری زندگی کو خدا ترسی کی زندگی میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس امت کو حیاتِ تازہ اسی وقت مل سکتی ہے جب کہ اس کے اندر یہ انقلابی ایمان موجود ہو۔

۲- عقیدۂ توحید سے رسالت اور آخرت کا گہرا تعلق ہے۔ عقیدۂ توحید کو صحیح معنوں میں قبول کرنے کے بعد رسالت اور آخرت کا انکار آسان نہیں

ہے۔ رسالت پر اور حضرت محمد ﷺ کے آخری رسول ہونے پر امت کا ایمان ہے، لیکن اس کی انفرادی زندگی اور اجتماعی معاملات میں آپ کے لائے ہوئے دین اور آپ کی تعلیمات کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو اسے فی الواقع حاصل ہونا چاہیے۔ امت کے درمیان اس کے علماء کے کرنے کا ایک کام یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی جائے کہ نجات اور کامیابی صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کی اتباع میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ (الاعراف: ۳)

اتباع کرو اس کتاب کی جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر اُتاری گئی ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے اولیا کے پیچھے نہ چلو کم ہی تم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

یہ صریح حکم ہے اس بات کا کہ صرف اللہ کے نازل کردہ دین کی اتباع ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ کسی کو خدائی کا مقام دینا اور اس کی اتباع کرنا صحیح نہیں ہے۔ دنیا جن غلط راہوں پر سرپٹ دوڑ رہی ہے وہ سب ضلالت کی راہیں ہیں، ان پر چل کر آدمی کبھی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ ان کی بنیاد حق و صداقت اور دلیل و برہان پر نہیں بلکہ مکر و فریب اور ظن و تخمین پر ہے:

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○ (الانعام: ۱۱۶)

(اس) زمین پر جو لوگ رہتے ہیں اگر ان میں سے اکثر کی تم اتباع کروگے تو وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ تو بس اپنے خیال کے پیچھے چلتے ہیں، اور محض اٹکل سے کام لے رہے ہیں۔

امت کے ذہن و فکر کو اس طرح بدلنا ہوگا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو ہر معاملے میں فیصلہ کن حیثیت دے اور اس کے مقابلہ میں کسی بھی فکر اور نظریہ کو قبول نہ کرے۔ اس کے بغیر امت کی جزوی اصلاح تو ہوسکتی ہے، کلی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اس کے اندر کسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۳- قرآن مجید نے آخرت کا زندہ تصور دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمیشہ اس کا استحضار رہے۔ عقیدۂ آخرت امت کے صرف تحت الشعور ہی میں نہ ہو، بلکہ اس کے ذہن و فکر پر چھا جائے اور اس کے لیے محرک عمل بن جائے۔ وہ اس یقین کے ساتھ سفرِ حیات طے کرے کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ دنیا اور اس کی ساری چیزیں فانی ہیں، یہاں کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے دوام ہو اور جو باقی رہے۔ قیامت آئے گی، اس میں کوئی شک نہیں، وہ ضرور آئے گی، لیکن اس سے قطعِ نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا ہر فرد کے لیے بہ ہرحال فانی ہے۔ کوئی بھی شخص ایک خاص مدت سے زیادہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ عمر کے ساتھ اور وقت کے ساتھ یہاں کی ساری آسائشیں ایک ایک کرکے چھنتی چلی جاتی ہیں یا وہ خود ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ	جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ سب ختم ہوجائے گا، باقی رہنے والی چیزیں تو وہی ہیں جو اللہ کے پاس ہیں۔ (النحل: ۹۶)

آدمی کو اگر یہ یقین ہو کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ بہت جلد اس سے چھن جائے گا تو اس کی قدر و قیمت بھی اس کی نگاہ میں گھٹ جائے گی۔ وہ اسے متاعِ قلیل اور متاعِ فانی تصور کرے گا۔ قرآن نے شروع ہی سے یہ تصور دیا کہ آدمی آخرت کو ہر معاملہ میں پیشِ نظر رکھے۔ آخرت کے مقابلے

میں دنیا کی زندگی قابلِ ترجیح نہ بننے پائے۔ انسان کے لیے دنیا نہیں آخرت دارِ قرار ہے، اسی کے لیے اس کی ساری تگ و دو ہونی چاہیے۔ نادان ہے وہ جو دنیا کو ترجیح دیتا اور ایک بہتر زندگی کے مقابلے میں کم تر زندگی کو پسند کرتا ہے۔ لیکن جدھر دیکھیے اسی نادانی میں ہر کوئی مبتلا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى۝

بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو جب کہ دارِ آخرت بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ (الاعلیٰ: ۱۶-۱۷)

اسلام جس طرح کی تبدیلی لانا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ آخرت پر مضبوط ایمان اور بھرپور یقین ہو۔ آدمی اس حقیقت کو تسلیم کرکے زندگی گزارے کہ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تھوڑی آزادی اس لیے دی ہے تاکہ دیکھے کہ ہم اس کی عبادت و اطاعت کی راہ اختیار کرتے ہیں یا اس کے احکام سے سرکشی اور اس کی ہدایت سے بغاوت کرتے ہیں۔ آخرت میں اللہ کی نعمتیں اور اس کے انعامات اس کے فرماں برداروں کے لیے ہیں۔ اس کے نافرمانوں کو کوئی چیز اس کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ قرآن نے آخرت کے تصور کو جس زور اور قوت سے ابھارا ہے اسی زور اور قوت سے اسے ابھارنا ہوگا۔

۴- امت کے درمیان کرنے کا ایک اہم کام یہ ہے کہ اسے دین پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش کی جائے، اس وقت باطل افکار و خیالات کی جو ہوا بین الاقوامی سطح پر اور خود اس ملک میں چل رہی ہے، وہ آہستہ آہستہ آدمی کے دینی رجحانات کو کم زور سے کم زور تر کر رہی ہے اور غیر شعوری طور پر وہ دین سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں اس بات کی ضرورت ہے کہ اس

امت کو استقامت کا سبق دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام علمائے کرام ہی کرسکتے ہیں۔ ان کو بتانا ہوگا کہ ان حالات میں دین پر ثابت قدم رہنا گو دشوار ہے لیکن ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور اس کا اجر و ثواب بھی غیر معمولی ہے۔ دنیا و آخرت میں یہی فوز و فلاح کی راہ ہے۔ اس کے لیے ہر طرح کے نقصانات کو برداشت کرنے اور ہر قسم کی قربانی کے لیے انھیں تیار ہونا چاہیے۔ اس راہ میں جان کی بازی بھی لگانی پڑے تو ایک صاحبِ ایمان کو دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

قرآن نے ان لوگوں کو جنت کی بشارت دی ہے جو اللہ کے دین پر استقامت کا ثبوت دیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ○ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ○

(حٰم السجدۃ: ۳۰-۳۲)

بیشک جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم گئے تو ان پر فرشتے اس خوش خبری کے ساتھ اترتے ہیں کہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ جنت کے ملنے پر جس کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ہم تمھارے ساتھی رہے ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی ہوں گے، تمھارے لیے جنت میں وہ سب کچھ ہے جو تمھارا جی چاہے اور وہ سب کچھ ہے جو تم طلب کروگے۔ یہ خدا کی طرف سے میزبانی ہے، جو غفور رحیم ہے۔

'رَبُّنَا اللّٰهُ' کہنے کا مطلب یہ اعلان کرنا ہے کہ اللہ ہمارا رب ہے، ہم اس کے بندے ہیں اور اسی کی بندگی اور اطاعت کریں گے۔ اس کے

علاوہ کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں گے۔ استقامت یہ ہے کہ اس اظہار و اعلان کے بعد مخالف ماحول میں جو آزمائشیں آئیں ان پر آدمی ثابت قدم رہے۔ ورنہ کوئی شخص چپکے سے دل میں رَبُّنَا اللّٰهُ کہہ دے اور مخالفتوں کے درمیان اس کے اظہار و اعلان کی جرأت نہ کر سکے تو اس کے لیے استقامت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

قرآن کا وعدہ ہے کہ آدمی اللہ کے دین کے لیے استقامت کا ثبوت فراہم کرے تو دنیا اور آخرت میں اللہ کے فرشتے اس کے ساتھ ہوں گے، آخرت میں اسے خوف وغم سے پاک زندگی ملے گی اور جنت کی ابدی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اس استقامت کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی نے جس اللہِ واحد کا نام لیا ہے اور جس کے معبودِ برحق ہونے کا اعلان کیا ہے اس کی طرف دنیا کو دعوت دے اور اپنے مومن و مسلم ہونے کا قول و عمل سے ثبوت فراہم کرے۔ یہی بات اس کے بعد کی آیت میں کہی گئی ہے:

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ○ (حٰمٓ السجدۃ:۳۳)

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں اللہ کے فرماں برداروں میں سے ہوں۔

اسلامی تاریخ کے اوراق استقامت کی مثالوں سے تاب ناک ہیں۔ اسی استقامت کا ثبوت حضرت بلالؓ نے دیا جب انھیں تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیا جاتا اور لڑکے گلی کوچوں میں انھیں کھینچتے پھرتے اور ان کی زبان احد، احد کا اعلان کرتی جاتی۔ حضرت سمیہؓ، حضرت عمارؓ، حضرت یاسرؓ، حضرت صہیبؓ اور حضرت خبیبؓ نے دنیا کو اسی استقامت کی راہ دکھائی اور کفر اور شرک کے

ماحول میں یہ اعلان کرتے رہے کہ اللہِ واحد کے دین پر ہم قائم ہیں اور قائم رہیں گے، کوئی چیز ہمیں اس سے ہٹا نہیں سکتی۔

حضرت ابو سفیانؓ کے قبولِ اسلام سے پہلے کا واقعہ ہے کہ شاہ ہرقل نے ان سے دریافت کیا کہ کیا کوئی شخص محمد (ﷺ) پر ایمان لانے کے بعد اس سے پھر جاتا ہے؟ ابو سفیان نے جواب میں کہا کہ ایسا واقعہ ابھی تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس نے کہا: یہ ان کے نبی ہونے کی علامت ہے، دین کی حلاوت جب آدمی چکھ لیتا ہے تو اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ کسی بھی حال میں اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اسلام اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کا نام ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے اس عہد و پیمان پر ہر حال میں ثابت قدم رہیں اور نازک ترین حالات میں بھی اس میں فرق نہ آنے دیں۔ جنگ احزاب میں مسلمان، دشمنوں کے نرغے میں تھے اور قرآن کے الفاظ میں کلیجے منہ کو آ رہے تھے، لیکن اہلِ ایمان کے بارے میں قرآن نے شہادت دی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ○ (الاحزاب: ۲۳)

ایمان والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ ان میں وہ بھی ہیں، جنھوں نے اپنا ذمہ پورا کر دیا اور وہ بھی ہیں جو (سرفروشی کا) انتظار کر رہے ہیں۔ اور اللہ سے انھوں نے جو عہد کیا تھا اس میں ذرّہ برابر تبدیلی نہیں کی۔

مطلب یہ کہ ان میں سے بعض نے اللہ کی راہ میں جان دے ڈالی اور کچھ اس انتظار میں ہیں کہ کب وقت آئے گا اور کب جان دیں گے۔ انھوں نے اللہ سے استقامت اور ہر طرح کی قربانی کا جو عہد کیا تھا اس پر

جمے رہے، اس میں کوئی فرق آنے نہ دیا۔

اس وقت جو کام کرنے کا ہے وہ یہ کہ امت کو استقامت کی راہ دکھائی جائے اور اسے دین پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ حضرت معاذؓ کو رسول اللہ ﷺ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

لاَ تشرک باللّٰــــہ و ان قُتِّلتَ او حُرِّقتَ (مسند احمد)

اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو، چاہے تمھیں قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔

اسی جذبے کو امت کے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی کا درس اصحاب الاخدود کے واقعہ میں دیا گیا ہے کہ اہلِ ایمان جلا کر ختم کردیے گئے، لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی:

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِۙ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِۙ اِذۡهُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌۙ وَّ هُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌؕ وَ مَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِۙ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌؕ (البروج: ۴-۹)

مار ڈالے گئے کھائیوں والے جن میں ایندھن کی آگ تھی اور وہ ان کے کنارے بیٹھے تھے اور اہلِ ایمان کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ان سے صرف اس لیے بدلہ لیا کہ وہ اللہ پر، جو غالب اور ستودہ صفات ہے، ایمان رکھتے تھے۔ وہ اللہ جس کے لیے آسمان اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

انھوں نے جان دے کر یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کا دین جان سے زیادہ قیمتی ہے، اس کے لیے ہر چیز یہاں تک کہ جان بھی قربان کی جاسکتی ہے لیکن جان بچانے کے لیے دین کو چھوڑا نہیں جاسکتا، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کا دین جس وقت جان کا نذرانہ طلب کرے تو اس دین کے ماننے

والے یہ نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہوں، اس سے دریغ نہ کریں:

وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ

تاکہ اللہ جان لے ان لوگوں کو جو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور تم میں سے بعض کو شہید بنائے۔ (یعنی شہادت سے سرفراز کرے) (آل عمران: ۱۴۰)

اس وقت ضرورت ہے کہ امت میں استقامت کی روح اس طرح پھونکی جائے کہ اس کے نزدیک دین ہر چیز پر مقدم ہوجائے اور اس کی خاطر وہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائے۔

۵- اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیرت و کردار کو بلندی عطا کرتا ہے۔ اس نے اعلیٰ کردار اور پست کردار کی جس تفصیل سے وضاحت کی ہے، کسی دوسرے آسمانی صحیفہ میں اتنی تفصیل شاید ہی مل سکے۔ علمائے امت کی ذمے داری ہے کہ وہ افرادِ امت کے اندر وہ خوبیاں اور اوصاف پیدا کرنے اور ان کم زوریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں، جن کی قرآن و حدیث میں نشان دہی کی گئی ہے۔ اسلام کی جن خوبیوں نے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ان میں اس کے ماننے والوں کا کردار بھی رہا ہے۔ مکے میں مسلمان بہت تھوڑی تعداد میں تھے، ان کی کم زوری و ناتوانی، غربت و افلاس اور جن مصائب و مشکلات اور آزمائشوں سے وہ گزر رہے تھے، انھیں دیکھ کر انھیں ناکام و نامراد سمجھا جا رہا تھا لیکن قرآن نے پورے زور اور قوت سے اعلان کیا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (مومنون: ۱) ایمان والے کامیاب ہوگئے۔

یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمان جس عقیدے و کردار کے حامل ہیں وہ اتنا ارفع و اعلیٰ عقیدہ ہے کہ اس کے ماننے والے کبھی ناکام نہیں ہوسکتے۔ شرک و کفر کے مقابلے میں جو شخص توحید خالص کا علم بردار ہو وہ دنیا میں بھی پاکیزہ

زندگی گزارے گا اور آخرت میں بھی بامراد ہوگا، پھر دلیل کے طور پر ان کا کردار پیش کیا گیا کہ جہاں اللہ واحد کی عبادت کا تصور نہیں ہے اور جہاں پوری قوم شرک میں لت پت ہے وہاں ان کے اندر اللہِ واحد کے سامنے سر جھکانے کا جذبہ پایا جاتا ہے اور وہ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں اور اس کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاں پورا ماحول لغویات میں مبتلا ہے ان کا دامن اس سے پاک ہے، جہاں دولت حرام کاموں میں اور عیش وعشرت میں اڑائی جارہی ہے وہاں وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرکے اپنے نفس کو اور اپنے مال کو پاک کر رہے ہیں، جس سوسائٹی میں زنا اور بدکاری پھیلی ہوئی ہے اسی سوسائٹی میں وہ باعفت زندگی گزار رہے ہیں، اپنے جنسی جذبات کی تسکین کے لیے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتے، جہاں دیانت و امانت اور ایفائے عہد جیسی خوبیاں پامال ہو رہی ہیں وہاں ان کا دامن ان خوبیوں سے مالا مال ہے۔

قرآن مجید نے اہلِ ایمان کی جو تصویر پیش کی وہ کوئی خیالی تصویر نہ تھی بلکہ دنیا سر کی آنکھوں سے اس سیرت وکردار کو دیکھ رہی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کو ایمان وعقیدے سے منحرف کیا جاسکتا ہے، انھیں خریدا جاسکتا ہے، ان کے پاس دولت ہے تو ناپسندیدہ کاموں میں صرف ہو رہی ہے یا ان میں سے کسی نے بے راہ رَوی اور اخلاقی پستی کا مظاہرہ کیا ہے یا کسی کے ساتھ اس کا معاملہ مکر وفریب اور دھوکے کا رہا ہے۔ یہ اُمت جب ان خطوط پر تیار ہوئی تو اسے خیرِ اُمت اور اُمتِ وسط کا خطاب دیا گیا اور اس کے ذریعے دنیا میں اللہ کے دین کی سربلندی اور عدل وقسط کا قیام عمل میں آیا اور وہ فکری، تہذیبی اور سیاسی انقلاب رونما ہوا جو دنیا کا سب سے پاکیزہ اور سب سے مقدس انقلاب تھا۔

اس عظیم انقلاب کے لیے اُمت کو تیار کرنا علمائے کرام کی ذمے داری

ہے۔ اُمت کے اندر تھوڑی بہت اصلاح کے کام ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے، اس انقلابی تصور کے بغیر اُمت کی کوئی امتیازی حیثیت نہیں ہوگی۔ وہ دوسری قوموں کی طرح ایک قوم ہوگی اور اسے کوئی امتیاز حاصل نہ ہوگا۔ خیرِ اُمت کے تصوّر اور اسے زندہ کرنے کے عزم اور حوصلے کے ساتھ علمائے کرام آگے بڑھیں گے تو اُمت کی کامل اصلاح بھی ہوگی اور وہ دنیا میں قائدانہ کردار بھی ادا کر سکے گی۔ پھر اللہ نے چاہا تو امت کی ایک نئی تاریخ مرتب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(ماہ نامہ 'راہِ اعتدال' عمر آباد۔ ستمبر ۲۰۰۵ء)

اسلامی نقطہ نظر کی ضرورت ہے

اس وقت ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اتنی ترقی کہ ایک صدی قبل شاید اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ اس کے نتیجے میں بہت سی مادی دشواریوں پر قابو پالیا گیا ہے۔ مختلف قسم کی آسانیاں اور سہولتیں وجود میں آئی ہیں اور دنیا زیادہ پرکشش ہوگئی ہے۔ آمد و رفت کے تیز رفتار ذرائع کی وجہ سے مسافتیں کم ہوگئی ہیں، خیالات کی ترسیل اور ابلاغ آسان ہوگیا ہے، جو معلومات چھوٹے سے دائرے میں محصور ہوتی تھیں وہ عام ہو رہی ہیں۔ نشر و اشاعت ایک وسیع انڈسٹری کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ جو چیز چھپتی ہے وہ گوشے گوشے میں پھیل جاتی ہے۔ میڈیا اتنا طاقت ور ہے کہ ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو دنیا کے سامنے لے آتا ہے اور اس پر بحث شروع ہو جاتی ہے۔ معیشت بہتر ہوئی ہے، پیداوار میں اضافہ ہوا ہے، خوش حالی آئی ہے، معیارِ زندگی بلند ہوا ہے، صحت اور تندرستی کی طرف توجہ ہے۔ امراض کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ طبی سہولتیں فراہم ہیں، اوسط عمر میں اضافہ ہوا ہے۔ ان سب باتوں کے مظاہر ہر طرف دیکھے جا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس ترقی کا پورا فائدہ اصلاً ایک چھوٹے سے طبقہ ہی کو حاصل ہے، لیکن عام آدمی بھی کسی نہ کسی درجے میں اس سے فیض یاب ہو رہا ہے۔

یہ آج کی سائنسی ترقی اور اس کے فوائد اور ثمرات کا حال ہے۔ دوسری طرف سماجی، معاشرتی اور سیاسی سطح پر پوری دنیا زوال اور پستی کی شکار ہے۔ اس سے نکلنے کی

کوئی راہ اسے دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ موجودہ دور انسان کے بعض بنیادی حقوق کو تسلیم کرتا ہے، ان میں زندہ رہنے، عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنے، وسائل حیات سے بلاامتیاز فائدہ اٹھانے، عقیدہ اور مذہب پر عمل کرنے، اظہارِ خیال اور عمل کی آزادی جیسے حقوق شامل ہیں۔ یہ حقوق قانوناً تو حاصل ہیں لیکن عملاً پامال ہو رہے ہیں۔ عام آدمی ان کی حفاظت نہیں کر پا رہا ہے۔ عدل و انصاف اور قانون کی حکم رانی کا ہرطرف چرچا ہے، لیکن ظلم و زیادتی کی حکومت ہے اور عدل و انصاف کا حصول آسان نہیں رہ گیا ہے، انسان فطری طور پر چاہتا ہے کہ پرسکون اور امن و امان کی زندگی گزارے، لیکن فتنہ و فساد اور اضطراب کی فضا میں سانس لینے پر مجبور ہے، مساوات اور برابری کے دعوے ہیں لیکن کم زور افراد اور قومیں طاقت ور افراد اور قوموں کا ہدف ستم بنی ہوئی ہیں اور ان کا ہر سطح پر استحصال ہو رہا ہے۔ انسان کے سامنے مال و دولت اور عیش و عشرت کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رہ گیا ہے، اس کے لیے غلط سے غلط اقدام میں بھی اسے تامل نہیں ہوتا۔ اخلاق اور قانون پر خواہشاتِ نفس غالب آ گئی ہیں اور ترقی کے نام پر بے حیائی اور جنسی آوارگی کو فروغ مل رہا ہے۔ انسان جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے سماج اور قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکنا چاہتا ہے۔ خاندان سے انسان کا جو فطری اور جذباتی تعلق تھا وہ ٹوٹ رہا ہے، الفت و محبت، خدمت اور ایثار و قربانی کی جگہ خودغرضی کی فضا پرورش پا رہی ہے۔ اپنی تمام تر مادی ترقی کے باوجود معاشرے کے رگ و ریشے میں فساد پوری طرح پھیل چکا ہے اور بسااوقات نہ چاہتے ہوئے بھی آدمی کو اس کے کڑوے کسیلے پھل کھانے پڑ رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ دورِ حاضر کے اس بگاڑ کی وجہ کیا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ صحیح نظریۂ حیات سے محروم ہے۔ اس نے انسان کو مادی لحاظ سے تو بہت کچھ دیا، لیکن اس کائنات اور خود انسان کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر نہیں فراہم کر سکا۔ اس کی فکری اساس غلط ہے اس لیے وہ ایک طرف پیش قدمی کر رہا ہے تو دوسری طرف پستی کا

شکار ہے۔ متوازن اور ہمہ جہت ترقی اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کی بنیاد صحیح فکر پر ہو۔

بعض لوگ سوچتے ہیں کہ اگر موجودہ دور کی فکری اساس غلط ہے تو اس نے اتنی ترقی کیسے کی ہے؟ کیا غلط فکر کے ساتھ اس طرح کی ترقی ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مادی ترقی کے لیے صحیح نظریۂ حیات کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی اس ترقی کا امکان ہے۔ قرآن مجید نے اس معاملے میں ہماری راہ نمائی کی ہے۔ اس نے عبرت و نصیحت کے لیے بعض قدیم قوموں کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ان کا فلسفۂ حیات غلط تھا، لیکن مادی ترقی کی راہیں ان پر بند نہیں تھیں۔ ان کے سامنے صرف دنیا تھی اور وہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔ چناں چہ انھوں نے اپنی محنت اور صلاحیت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھایا اور خوب ترقی کی۔ قوم عاد جسمانی طور پر بڑی توانا اور تندرست قوم تھی۔ قوت و طاقت میں اس وقت اس جیسی کوئی دوسری قوم نہ تھی (الفجر: ۶-۸)۔ اس قوم نے تفریح اور عیش کی خاطر اور شان وشوکت کے مظاہرے کے لیے بڑی بڑی عمارتیں اور قلعے اس طرح تعمیر کیے جیسے اسی دنیا میں اسے ہمیشہ رہنا ہے۔ اس کے علاقے میں عمدہ زراعت تھی، سرسبز و شاداب باغات تھے اور چشمے رواں تھے۔ اسے افرادی قوت بھی حاصل تھی۔ طاقت کا یہ عالم تھا کہ کسی پر یہ قوم ہاتھ ڈالتی تو اس کے شکنجے سے نکلنا آسان نہ تھا۔ (الشعراء: ۱۲۳-۱۳۴)

قوم ثمود کا بھی یہی حال تھا اس کے علاقے میں زراعت کو بڑا عروج حاصل تھا، پھلوں کی خوب پیداوار تھی، اس کے کارناموں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ پہاڑوں کو تراش کر بڑی مہارت کے ساتھ مکانات تعمیر کیا کرتی تھی۔ (الفجر:۹، الشعراء: ۱۴۷-۱۴۹)

مصر میں فرعون کا بڑا دبدبہ تھا، وہ بڑی فوجی طاقت کا مالک تھا، اس کے لیے جگہ جگہ خیمے لگتے تھے، ملک میں خوش حالی تھی، باغات تھے، چشمے تھے، دولت کے خزانے تھے اور شاندار مکانات تھے۔ (الفجر:۱۰، الشعراء: ۵۷، ۵۸)

قرآن مجید بتاتا ہے کہ یہ اور ان جیسی دوسری قوموں کی نادانی یہ تھی کہ وہ مادی

ترقی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھی تھیں۔ اس سے آگے سوچنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انھیں اپنے علم وفن پر بڑا ناز تھا اور کسی راہ نمائی کو قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہ تھیں۔ اللہ کے رسولوں نے انھیں راہِ ہدایت دکھائی لیکن اسے انھوں نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دن پورے ہونے لگے، ان کی مادّی ترقی انھیں ہلاکت سے نہ بچا سکی اور وہ تباہ و برباد ہوگئیں۔

قریشِ مکہ نے اللہ کے رسول محمد ﷺ کی مخالفت کی تو قرآن نے کہا کہ تم سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقت ور قوموں نے اللہ کے رسولوں کی مخالفت کی اور ان کی ہدایت قبول کرنے سے انکار کیا تو صفحۂ زمین سے مٹا دی گئیں۔ ان کے مقابلے میں تمھاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر تم اللہ کے رسول کی مخالفت کر رہے ہو تو اپنے انجام پر غور کرلو۔

وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ○

(سبا:۴۵)

ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی تکذیب کی، حالاں کہ جو کچھ ہم نے ان کو دیا تھا اس کے عشرِ عشیر کو بھی یہ نہیں پہنچے۔ انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو (دیکھو کہ) میرے انکار کا کیا انجام ہوا۔

قرآن مجید نے بعض قوموں کا نام لے کر بھی قریشِ مکہ کو تنبیہ کی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ○ وَ ثَمُوْدُ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَّ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ ط اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ○ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ○

(ص:۱۲-۱۴)

اُن سے پہلے جھٹلا چکی ہے قوم نوح (قوم) عاد اور فرعون جو میخوں والا تھا۔ (قوم) ثمود، قوم لوط اور ایکہ والے (حضرت شعیبؑ کی قوم) یہ سب بڑی طاقتیں۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب ان پر آ کر رہا۔

اس طرح قرآن نے یہ حقیقت واضح کی کہ کائنات میں موجود طبیعی قوانین کو

دریافت کرنے اور ان کو کام میں لانے سے مادّی ترقی ممکن ہے۔ جو قوم اس پر عمل کرے گی، اس پر مادّی ترقی کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ لیکن اس ترقی کو کنٹرول کرنے اور پوری زندگی کو صحیح سمت دینے کے لیے صحیح نظریۂ حیات کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر انفرادی اور اجتماعی زندگی فساد سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

اسلام اس معاملے میں ہماری رہ نمائی کرتا ہے۔ وہ صحیح نظریۂ حیات پیش کرتا ہے۔ وہ ان تمام سوالات کا اطمینان بخش جواب دیتا ہے جو انسان کے ذہن میں اس وسیع کائنات اور خود اس کی ذات کے بارے میں ابھرتے ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا کیا ہے؟ کیسے وجود میں آئی؟ کیا یہ ہمیشہ رہے گی یا اس کی رونق کبھی ختم ہوجائے گی؟ انسان کو کس لیے پیدا کیا گیا ہے، اسے جو مختلف صلاحیتیں دی گئی ہیں ان کا مقصد کیا ہے؟ اللہ نے اس کی ہدایت اور رہ نمائی کا کیا انتظام کیا ہے؟ اس کی آخری منزل کیا ہے؟ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے؟

اسلام ان بنیادی سوالات کا جواب ہی نہیں فراہم کرتا بلکہ ان کی اساس پر زندگی کا ایک پورا نظام پیش کرتا ہے۔ اس سے ہر گوشۂ حیات میں متوازن ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور آدمی کو قلبی سکون اور راحت بھی حاصل ہوتی ہے۔

ایک خیال یہ پایا جاتا ہے کہ مذہب کی تعلیمات سے آدمی کو چاہے روحانی سکون حاصل ہوجائے لیکن مادّی ترقی ممکن نہیں ہے۔ قرآن مجید نے جگہ جگہ اس خیال کی تردید کی ہے، اس لیے کہ یہ مادہ پرست ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔

یہود اپنی دنیا داری میں مشہور ہیں۔ اس کے لیے انھیں کوئی بھی غلط اور ناجائز طریقہ اختیار کرنے میں کبھی تامل نہیں رہا۔ یہ ایمان کی کم زوری اور اس احساس کا نتیجہ تھا کہ دین کی راہ سے دنیا حاصل نہیں کی جاسکتی۔ قرآن نے کہا اگر وہ دین پر ٹھیک ٹھیک عمل کریں تو دنیا ان کے قدم چومنے لگے گی، زمین اپنے خزانوں کے منھ کھول دے گی

اور آسمان سے نعمتوں کی بارش شروع ہو جائے گی۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ط مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ط وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ع (المائدۃ:٦٦)

اگر یہ توریت اور انجیل کو اور ان دوسری کتابوں کو قائم کرتے جو ان کے رب کی جانب سے ان کے لیے نازل کی گئی تھیں، تو رزق ان کے اوپر سے بھی اترتا اور ان کے قدموں کے نیچے سے بھی ابلتا۔ لیکن ان میں سے ایک چھوٹی سی جماعت سیدھی راہ پر ہے اور ان میں کے زیادہ تر برے کام کر رہے ہیں۔

یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اسلام دین و دنیا کی فلاح کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کا مطالعہ اسی رخ سے ہونا چاہیے، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر مغرب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلام اس حیثیت سے دنیا کے سامنے نہ آنے پائے۔ اس نے اسلام کو سمجھنے کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس نے اسے دیکھا تو صرف اس نقطۂ نظر سے دیکھا کہ اسے کس طرح ناقابلِ قبول اور ناقابلِ عمل قرار دیا جائے۔ اس کے لیے اس نے اسلام کے عقائد اور اس کی تعلیمات پر اعتراضات کا جو سلسلہ اپنی تہذیب کے غلبہ کے بعد شروع کیا وہ اب تک جاری ہے بلکہ دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں بعض پہلوؤں سے شدت بھی آگئی ہے۔ اس کے خلاف علمی، سیاسی، تہذیبی ہر طرح کے محاذ کھول دیے گئے ہیں۔ اس کی تصویر اس طرح مسخ کی جا رہی ہے کہ اس کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو اور اسلام کا نام آتے ہی لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں۔

اسلام کے بارے میں مغرب کے اس رویہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام موجودہ فکر اور تہذیب کے لیے زبردست چیلنج ہے۔ اس کی نظریاتی اور عملی قوت کو مخالف طاقتیں پوری طرح محسوس کر رہی ہیں اور اس سے خوف زدہ ہیں۔ یہاں بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

۱- جو بھی شخص اسلام پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اندر

موجودہ تہذیب کا متبادل بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے، جس کا اس نے جواب نہ دیا اور اس کا حل نہ پیش کیا ہو۔ چاہے اس کا تعلق عقیدہ اور فکر سے ہو، عبادات و اخلاق سے ہو، تہذیب و معاشرت سے ہو، معیشت و سیاست سے ہو یا مادیت و روحانیت سے۔ کسی معاملے میں اس کے نقطہ نظر سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام نے اسے نظر انداز کیا ہے یا اس سلسلے میں راہ نمائی نہیں کی ہے۔

۲- آج قیادت کا منصب مغرب کو حاصل ہے۔ پوری دنیا پر عملاً اسی کی حکومت ہے اور ہر جگہ اسلام کے ماننے والوں کو بری طرح دبایا اور کچلا بھی جا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تقریباً ہر جگہ اسلام کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ خود مغرب میں اس رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ یقین بھی اسلام کے ماننے والوں میں عام ہے کہ اس کے پاس ایک بہتر اور برتر نظامِ فکر و عمل ہے، صحیح عقیدہ اور فکر ہے، بہتر اخلاقیات ہیں، اعلیٰ تہذیب و تمدن ہے اور سیاست کے ایسے اصول ہیں جو دنیا کو بے لاگ عدل و انصاف فراہم کرسکتے ہیں اور جن کے ذریعے ہر طرح کے ظلم کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی برتری کا یہ یقین صرف ان لوگوں میں نہیں ہے، جو دورِ جدید سے بے خبر اور 'قدامت پسند' سمجھے جاتے ہیں، بلکہ ان افراد میں بھی پرورش پا رہا ہے، جو مغرب میں پیدا ہوئے، اس کی گود میں پلے بڑھے اور جن کی تعلیم و تربیت ان کے اداروں میں ہوئی اور جن کی ذہن سازی میں وہ مستقل لگے ہوئے ہیں۔ مغرب کے لیے تشویش کا پہلو یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں وہ مسلمانوں کے ذہن کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہے۔ وہ مغرب کے فکر کو برداشت تو کر رہے ہیں، قبول نہیں کر رہے ہیں۔

۳- اس وقت عالم اسلام میں، بلکہ پوری دنیا میں ایسی تحریکیں موجود ہیں جو اسلام کو ایک غالب قوت کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ اس صورتِ حال پر قانع اور مطمئن نہیں ہیں کہ دنیا پر فرماں روائی غیر اسلامی افکار کی ہو اور اسلام محکوم بن

کر رہے۔ ان تحریکات کے طریقۂ کار میں حالات کے لحاظ سے فرق ضرور ہے لیکن یہ سب اسلام کو سربلند اور غالب دیکھنا چاہتی ہیں اور اس کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ مغرب کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ ان تحریکات کے اثرات پھیل رہے ہیں۔ یہ آج کم زور ہیں لیکن کل طاقت ور ہوسکتی ہیں۔ اس احساس کے تحت مسلم راہ نماؤں اور ان کی نمایاں شخصیتوں کی تصویر بگاڑی جا رہی ہے، مسلم تنظیموں اور جماعتوں کو بدنام کیا جا رہا ہے، اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ اسلامی تحریکیں دستوری اور قانونی طریقے سے بھی کامیاب نہ ہونے پائیں اور کامیاب ہوں تو انھیں اقتدار میں آنے سے کسی نہ کسی طرح روک دیا جائے۔

۴۔ مغرب کو یہ فکر بھی پریشان کر رہی ہے کہ مسلم ممالک مادی لحاظ سے بھی اس موقف میں ہیں کہ وہ اس کے حریف بن سکتے ہیں۔ کسی فکر کو آگے بڑھانے اور اسے غالب کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ اسے حاصل ہیں۔ ان وسائل پر گو اس وقت عملاً قبضہ مغربی طاقتوں ہی کا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اپنا یہ قبضہ باقی رکھنا چاہتی ہیں، اس لیے کہ یہ ان کی مادی ترقی، خوش حالی اور اقتدار کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بیشتر ممالک کے سربراہوں کو قابو میں کر رکھا ہے۔ وہ ان کے اشاروں پر چل رہے ہیں اور ان کے مفادات کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جو مسلم ملک ان کے خلاف جانے کا ارادہ کرتا ہے، اسے ختم کرنے کی ہزار تدبیریں ان کے پاس موجود ہیں۔ لیکن یہ صورتِ حال دائمی نہیں ہے، یہ بدل سکتی ہے۔ وہ آزادانہ فیصلے اور اقدامات کرنے کے موقف میں ہوسکتے ہیں۔ اس وقت غالب امکان اس کا ہے کہ ان کے وسائل و ذرائع اسلام کی سربلندی کے لیے استعمال ہوں۔ یہ چیز مغرب کے لیے باعث تشویش ہے۔

اسلام، مسلم ممالک اور اسلامی تحریکوں کے بارے میں مغرب کے عزائم مخفی نہیں ہیں۔ ہر صاحب دانش انھیں سمجھ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی فکری اور تہذیبی

کم زوریاں بھی سامنے آرہی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کو سمجھنے کا رجحان بھی ابھر رہا ہے اور وہ مغرب کے عین مراکز میں خاموشی سے پھیل رہا ہے۔ اس کی فطری خوبیاں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ یہ صورتِ حال بہ ظاہر اسلام کے حق میں ہے لیکن خود اسلام کے ماننے والوں کو مختلف قسم کی کم زوریوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ جب تک وہ ان پر قابو نہ پالیں اور اسلام کا نمونہ نہ پیش کریں اسلام کی سربلندی کی تمنا پوری نہیں ہوسکتی۔ یہاں بعض کم زوریوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

۱- اللہ تعالیٰ کے دین کی اساس پر امت مسلمہ وجود میں آئی ہے۔ وہ اس پر اپنے ایمان و یقین کا آج بھی اظہار کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ دنیا اور آخرت کی فوز و فلاح اسی سے وابستہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس کی پوری زندگی دین کے تابع ہو اور اس کا ہر قدم دین کی راہ نمائی میں اٹھے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ دین کی اس پر گرفت کم زور پڑ چکی ہے، جو شخص دین دار تصور کیا جاتا ہے، اس کی پہچان یہ تو ہے کہ وہ نماز روزے اور بعض اخلاقیات کا پابند ہے، باقی یہ کہ اس کی شخصیت اس حیثیت سے نمایاں نہیں ہے کہ وہ دوسرے کے لیے بھی دردمند دل رکھتا ہے اور ملک و ملت کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس طرح پوری ملت کی کوئی مضبوط دینی پہچان نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو زندگی کے ایک محدود دائرے میں۔ سماجی یا معاشرتی سطح پر اس کا دینی کردار دنیا کے سامنے نہیں ہے۔

۲- آدمی کے اخلاق سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے اور اس کی عزت اور احترام پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ اس سے آگے اگر کوئی قوم اخلاق و کردار کا ثبوت فراہم کرنے لگے تو اس کا اعتبار قائم ہو جاتا ہے۔ دنیا اس پر بھروسہ کرنے لگتی ہے اور اس کی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سیرت و کردار کے لحاظ سے یہ امت کہیں بھی نمایاں نہیں ہے۔ اس کے متعلق یہ تصور نہیں ہے کہ وہ اخلاق کی پابند ہے۔ اس سے تعلق رکھنے والے راست باز اور قول و قرار کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے،

رشوت نہیں لے سکتے اور کسی غیر اخلاقی حرکت کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ امت کبھی ایسے افراد سے خالی نہیں رہی اور آج بھی ایسے افراد دیکھے جا سکتے ہیں، جن کے اخلاق قابل رشک ہیں اور وہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے بھی جاتے ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی امت کا کوئی اخلاقی امتیاز نہیں ہے، بلکہ اس کی اخلاقی کمزوریاں اس کی خوبیوں کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں ہیں۔ اس میں جب تک تبدیلی نہ ہو امت کا اعتبار قائم نہیں ہوسکتا۔

۳- مغرب کے سیاسی اقتدار اور اس کی تعلیم وتہذیب کی بنیاد دین و دنیا کی تفریق پر قائم ہے۔ اس کے فروغ سے امت کو ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس کے اندر بھی دین و دنیا کی تقسیم عمل میں آگئی۔ دینی اور دنیوی یا سیکولر تعلیم کے الگ الگ ادارے وجود میں آگئے اور دونوں کے میدان کار بھی الگ ہوگئے۔ امت نے عملاً یہ تسلیم کرلیا کہ علمائے دین انفرادی اور شخصی امور و معاملات میں دینی راہ نمائی فراہم کریں گے اور سیکولر تعلیم پائے ہوئے افراد کی قیادت اجتماعی اور سیاسی امور میں ہوگی۔ ان دونوں طبقات کے درمیان ربط و تعلق اور ایک دوسرے کے علم اور تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ اس وجہ سے امت سخت کشمکش میں ایک مدت سے مبتلا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قیادت تقسیم نہیں ہوسکتی۔ اگر تقسیم ہوگی تو اس کا ایک متعین رخ نہ ہوگا، بیشتر معاملات میں وہ تضاد کا شکار ہوگی اور کبھی ذہنی اور عملی یک سوئی اسے حاصل نہ ہوگی۔ اس امت کو زندگی کے ہر میدان میں اور ہر معاملہ میں دینی قیادت کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت آج کے حالات میں اسی وقت پوری ہوسکتی ہے، جب کہ علمائے دین اور سیکولر تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان بہت ہی مضبوط ربط و تعلق ہو، دونوں ایک دوسرے کے علم و تجربہ سے فائدہ اٹھائیں، جس طبقہ میں جس پہلو سے کمی ہے اسے دور کرنے میں اسے تامل نہ ہو اور دونوں طبقات مل کر اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کریں۔ کوئی دوسرا مقصد ان کے سامنے نہ ہو۔

۴- مسلمان ایک امت ہیں۔ ان کے درمیان اصول اور اساساتِ دین پر اتفاق ہے۔ البتہ تفصیلی احکام و مسائل میں اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات دورِ اول سے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ان اختلافات نے بہت ہی ناپسندیدہ شکل اختیار کرلی ہے۔ اس کا اثر شخصی، سماجی اور معاشرتی تعلقات پر پڑ رہا ہے۔ آپس میں دوری پائی جاتی ہے اور ہر فریق دوسرے کو حریف کی حیثیت سے دیکھنے لگا ہے۔ دین و شریعت اور موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ ہمارے رویہ میں تبدیلی آئے۔ اس کے لیے بعض باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

یہ اختلافات اصول میں نہیں فروع میں ہیں، جو اہمیت اصول کی ہے وہ فروع کی نہیں ہے۔ ان اختلافات کی نوعیت زیادہ تر علمی ہے۔ اسے علمی موضوع ہی ہونا چاہیے۔ اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ ان کا اثر آپس کے تعلقات پر نہ پڑنے پائے۔ بسا اوقات ہمارے نزدیک اپنے یا اپنے گروہ کے مفاد کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ ہم اسی کے لیے سوچتے اور تدبیر کرتے ہیں۔ ملت کا مفاد پیچھے چلا جاتا ہے۔ ملت کا وسیع تر مفاد پیشِ نظر ہو تو ہم اپنے اختلافات پر قابو پاسکتے ہیں اور اتحاد و اتفاق کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ امت کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اپنے حدود میں رہیں، اس کے اندر انھیں برداشت کرنے کا مزاج پیدا ہوجائے تو وہ دنیا کی ایک بڑی طاقت ہوگی۔ اسی لیے مغرب کی یہ کوشش ہے کہ ان اختلافات کو ہوا دی جاتی رہے تاکہ یہ امت آپس ہی میں دست و گریباں رہے اور اصل حریف کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جائے۔

(سہ ماہی 'تحقیقاتِ اسلامی' علی گڑھ۔ اپریل-جون ۲۰۰۸ء)